

کتاب

ہمیشہ یاد رکھئے

کہ پرچہ نہ پہنچنے کی اطلاع اگر اسی مہینے کے اندر نہ دی گئی تو آئندہ مہینے کے اخیر تک پانچ پیسہ کے ٹکٹ آسنے پر پرچہ دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پانچ گنا وصول کرتا ہے) اور اُس کے بعد قیمتاً یعنی ۸ روپے کے ٹکٹ وصول ہونے پر۔
 منیجر "نگار"

تصانیف نیاز پوری

پاکستان

شہاب کی سرگزشت

نگارستان

حضرت نیاز کا وہ عظیم نظیر افسانہ جو دو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اسکی زبان، اسکی تخیل، اسکی نکات بیان، اسکی مضامین اور اسکی لہجہ اور عالمی سحر کار کے درجہ تک پہنچے ہیں۔
 قیمت دو روپیہ (۲۰ روپے)
 علاوہ محصول

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل ہو چکے ہیں۔
 قیمت دو روپیہ (۲۰ روپے)
 علاوہ محصول

کتابت نیاز

جامستان

ادبی نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شائع ہوئے ہیں نیز وہ جو شائع نہیں ہوئے۔ جذبات نگاری اور سلاست بیان رنگینی اور ایلیمین کے لحاظ سے فن انشاء میں یہ بالکل پہلی چیز ہے جس کے ساتھ خطوط غالب بھی چھپکے علوم ہوتے ہیں۔
 تصویر حضرت نیاز، ۸ روپے کے کاغذ پر مجلد شائع ہوئی ہے۔
 قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (۲۰ روپے)
 علاوہ محصول

ادبی نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں ۳۲ افسانے ۳۳ تک کے درج ہیں۔ قدرت بیان، اعلیٰ تخیل اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسائل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزہ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔
 قیمت چار روپیہ (۴۰ روپے)
 علاوہ محصول

میں ۱۳ ستمبر کو شمیر جاری ہوں

اور اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں واپس آؤنگا
 آٹھ دس دن کی تاخیر سے شایع ہو۔
 اس لئے ممکن ہے کہ اکتوبر کا پرچہ
 اس دوران میں مجھ سے براہ راست
 ذریعہ پوسٹ ماسٹر سری نگر
 نیاز فچپوری

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ
 ہندوستان کے باہر سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ
 ششماہی چندہ میں "نگار" کا جنوری نمبر وجہ اضافہ رضی امت قیمت شامل ہوگا

جلد	فہرست مضامین ستمبر ۱۹۲۱ء	شمار
-----	--------------------------	------

۲	ملاحظیات	۲
۹	مجموعی رسم خط پر تبصرہ	۹
۱۴	ہم دونوں	۱۴
۱۹	ہندوستانی صحافت کمپنی کے عہد حکومت میں	۱۹
۲۲	تاریکی	۲۲
۲۶	نگاہ بازگشت	۲۶
۴۵	اپہن کا مستقبل حال کی روشنی میں	۴۵
۴۶	جوش ملیح آبادی	۴۶
۵۱	مکتوبات نیاز	۵۱
۵۲	مطبوعات موصولہ	۵۲
۵۹	منظومات	۵۹
۶۲	دماغی تفریح	۶۲

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۴۰

ستمبر ۱۹۷۷ء

شمار ۳

ملاحظات

لڑائی کے دو سال (یکم ستمبر ۱۹۷۷ء)

اب سے دو سال پہلے آج ہی کی تاریخ تھی جب جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر کے اس لڑائی کی ابتدا کی تھی اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ دو سال کے اندر یورپ کا نقشہ اتنا بدل جائے گا!

اس وقت یورپ کی چھوٹی بڑی تقریباً ایک درجن آزاد سلطنتیں اپنی آزادی کھو چکی ہیں اور نہیں کہا جاسکتا کہ آئندہ کیا ہونا ہو اور کب تک اس لڑائی کو جاری رہنا ہے

بعض لوگ کھپلی لڑائی پر قیاس کر کے موجودہ جنگ کی عمر بھی چھ سات سال سے کم نہیں بتاتے، لیکن ایک لڑائی کے حالات کو دیکھ کر دوسری لڑائی کے حالات پر حکم لگانا درست نہیں، کیونکہ ہر جنگ کے اسباب مختلف ہوا کرتے ہیں، فریقین کے توازن قوت میں فرق ہونا ہے اور اسلوب جنگ بھی بدلتا رہتا ہے

کھپلی لڑائی میں جرمنی کے ساتھ ترکی اور بلغاریہ بھی تھے، اس مرتبہ جرمنی نے تنہا اس لڑائی کو چھیڑا لیکن ایک سال کے اندر ہی اس نے تمام قرب و جوار کی حکومتوں کی مکر توڑ دی بعد کو آٹلی، بیشک اس کا شریک ہوا، لیکن اس کی شرکت سے اسے زیادہ فائدہ نہیں پہونچا، دوسری طرف برطانیہ کو لیجیہ کہ کھپلی لڑائی میں فرانس، آٹلی اور روس اس کے حلیف تھے، لیکن اس مرتبہ تنہا برطانیہ ہی کو تمام بار برداشت کرنا پڑ رہا ہے، کھپلی لڑائی میں ہوائی جہازوں کا استعمال زیادہ تر تجربہ کی صورت سے ہوا تھا اور اس مرتبہ ان سے پوری طرح کام لیا گیا، یہی حال ٹینکوں کا ہے کہ پہلے برطانیہ ہی نے ان کا استعمال خاص خاص موقعوں پر کیا تھا، لیکن

اس لڑائی میں میدانی مقابلہ کی کامیابی کا انحصار انھیں پر ہے

مہلے اگر جرمنی کی شکست کا سبب اندرونی انقلاب تھا تو اب اس کا امکان بہت ضعیف ہے، کیونکہ اُس وقت واقعی کھانے پینے کی اشیاء فراہم کرنے کے ذریعے اس کے پاس ختم ہو چکے تھے، لیکن اب چونکہ وہ تقریباً سارے یورپ پر چھایا ہوا ہے اور ہر جگہ سے اسے سامان مل رہا ہے، اس لئے اشیاء خورد و نوش کی کمی وہاں دیر میں محسوس کی جائے گی۔ لہذا اور پٹرول جن پر جنگ کا انحصار ہے وہ بھی ناروے اور رومانیہ پر قابض ہو جانے کی وجہ سے جرمنی کو کچھ نہ کچھ مل ہی رہا ہے۔ الغرض یہ لڑائی پچھلی لڑائی سے بہت مختلف ہے اور ہم اس کے جلد یا بدیر ختم ہونے پر کوئی حکم نہیں لگا سکتے

ہم زیادہ سے زیادہ انھیں حالات و واقعات پر رائے زنی کر سکتے ہیں جو ہمارے علم میں آچکے ہیں اور اگر مستقبل پر رائے زنی کرنے کے لئے واقعی کوئی ٹھوس وجہ رکھتے ہیں تو ان پر بھی اظہار خیال کیا جاسکتا ہے

اگر ہم کو یقین ہو جائے کہ یورپ کا موجودہ نقشہ اب نہیں بدلے گا اور جو ملک جرمنی کے قبضے میں آچکے ہیں وہ بدستور اسی کے پاس رہیں گے تو ہم کو یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہو سکتا کہ یہ لڑائی جرمنی نے جیت لی، لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو ہماری نگاہ صرف زمین کی پیمائش پر نہ ہونا چاہئے، بلکہ زمانہ کے رجحان پر ہونا چاہئے، کیونکہ فیصلہ کن حقیقت وہی ہے۔ پھر چونکہ یہ بات اصولاً طے ہو چکی ہے کہ کوئی قوم اب کسی دوسری قوم کی محکوم ہو کر زندہ رہنے پر راضی نہیں ہو سکتی، اس لئے جرمنی اپنی آخری کامیابی کے بعد بھی یورپ کے صرف اسی حصہ پر قابض رہ سکے گا، جہاں جرمن آبادی پائی جاتی ہے اور اُسے یورپ کا وہ تمام حصہ خالی کرنا پڑے گا جو اس وقت اس کے قبضہ میں ہے۔ اس لئے جرمنی کی موجودہ فتوحات، جنگ کو جاری رکھنے میں تو بیشک اسکی معاون ہو سکتی ہیں، لیکن لڑائی ختم ہونے کے بعد وہ اس کی سلطنت کا حصہ نہیں بن سکتیں

پھر اگر جرمنی کا ارادہ واقعی یہ ہے کہ وہ ساری دنیا پر چھا جائے، تو اس میں کامیابی اسی وقت ممکن ہے جب دنیا سے جمہوریت بالکل ختم ہو جائے اور یہ ممکن نہیں، کیونکہ اب جو دن گزرتا ہے، دنیا میں جمہوریت کیا بلکہ اس سے بھی زیادہ آزاد نظام حکومت کا مطالبہ دنیا کی طرف سے سخت تر ہوتا جا رہا ہے اور آمرانہ یا شخصی حکومتوں کا زمانہ اب باقی نہیں رہا، لیکن اگر ہٹلر نے یہ سب کچھ مجبور ہو کر کیا ہے، یعنی پولینڈ پر قبضہ قائم رکھنے کے لئے بعد کی تمام لڑائیاں اسے مجبوراً لڑنا پڑیں، تو بھی ایک نہ ایک دن اس سلسلہ کا ختم ہونا ضروری ہے اور یہ اختتام یقیناً ہٹلر کے حق میں مفید نہیں ہو سکتا

ہم مانتے ہیں کہ ہٹلر نے ڈنمارک، ناروے، پولینڈ اور بلجیم پر صرف اس لئے قبضہ کیا کہ فرانس و برطانیہ فوج کشی کر کے پولینڈ اس سے نہ چھین لیں، ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ فتح فرانس کے بعد اس نے برطانیہ پر اسی لئے ہوائی حملے کئے کہ وہ فرانس سے بیدخل نہ ہو جائے، ہم یہ بھی فرض کئے لیتے ہیں کہ اس نے یونان پر اسی لئے قبضہ کیا کہ بلقان کی طرف کا راستہ محفوظ کر کے وہ اپنی فتوحات یورپ کو مضبوط بنائے، ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ اس نے روس پر بھی صرف اسی لئے حملہ کیا کہ رومانیہ کا پٹرول اس کے ہاتھ سے نہ جائے اور آئندہ جنگ جاری رکھنے کے لئے اوکرائن کا غلہ اور باکو کا پٹرول اس کو ملجائے، اسی کے ساتھ تھوڑی دیر کے لئے یہ بھی فرض کر لیجئے کہ اس نے روس کو شکست دیدی، تو ظاہر ہے کہ پھر روس پر قبضہ قائم رکھنے کے لئے اُسے ایران، عراق اور ترکی میں بھی پاؤں جانے کی ضرورت ہوگی اور اگر یہاں وہ کامیاب ہو گیا تو پھر ایک طرف ہندوستان، برما، چین اور دوسری طرف، عرب اور مصر وغیرہ بھی اسے فتح کرنے پڑیں گے، پھر اس کے بعد افریقہ اور امریکہ کا بھی سوال پیدا ہوگا

الغرض یہ سلسلہ برابر جاری رہے گا، یہاں تک کہ دنیا میں سوائے جرمنی کے کسی اور کی حکومت باقی نہ رہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ہونا نہیں اور ایک نہ ایک دن جرمن فتوحات کی اس زنجیر کا سلسلہ ٹوٹنا ہے اور تمام کڑیوں کو علیحدہ علیحدہ ہو جانا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ فتح پولینڈ کے بعد، جرمنی، اس جنگ کو مغرب کی طرف جاری رکھنا نہیں چاہتا تھا بلکہ مشرق کی طرف اپنی فوجیں بڑھانا چاہتا تھا تاکہ روس کو سرزمین یورپ سے بالکل بیدخل کر کے مشرق کی طرف ڈھکیل دے اور بالٹک خطہ زیادہ دور ہو جائے، چنانچہ اسی لئے اس نے معرکہ پولینڈ کے بعد فرانس و برطانیہ سے صلح کر لینے کی خواہش ظاہر کی تھی لیکن اس اسکیم میں وہ کامیاب نہ ہوا۔ بنا براں موجودہ جنگ، جرمنی کے لئے کوئی ایسا سودا نہیں ہے جس نے اسے خوشی سے کیا ہو، بلکہ وہ لڑنے پر مجبور ہے اور خود اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ جنگ کا یہ سلسلہ نامتناہی کیونکر ختم ہو سکتا ہے۔

حملہ انگلستان

پچھلے سال اسی مہینے ہم جنگ کے یکساں حالات پر تبصرہ کر چکے ہیں۔ اور اس سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ ستمبر تک فرانس فتح ہونے کے بعد، جنگ کی نوعیت یہ ہو گئی تھی کہ جرمنی نے انگلستان پر ہوائی حملے شروع کر دیے تھے اور یہ حملے اتنے سخت اور اس قدر متواتر تھے کہ بعض اوقات دنیا انہیں پر اتمام جنگ کی پیشین گوئی کے لئے طیارہ ہو جاتی تھی۔

ان حملوں کی ابتدا ۸ اگست ۱۹۴۰ء سے شروع ہوئی اور سب سے پہلی مرتبہ جرمنی اور برطانیہ کی فضائی فوج کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں آنے کا موقع پیش آیا۔ چونکہ اس سے قبل ہر ملک جرمن حملہ کے بعد کسی نہ کسی طرح ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہو گیا تھا، اس لئے اس کو پوری توقع تھی کہ انگلستان کا بھی یہی حشر ہوگا اور وہ جرمنی کی زبردست فضائی تاخت کی تاب نہ لاسکے گا، لیکن ہٹلر کو جلد محسوس ہونے لگا کہ برطانیہ کی فضائی قوت اگر زیادہ زبردست نہیں، تو ایسی کمزور بھی نہیں ہے اور اس لئے اسے نہایت سخت حملے شروع کر دیے تاکہ برطانیہ کی مدافعت طیاروں کو آگے نہ بڑھنے دے اور اس میں شک نہیں کہ اول اول صورتیں کچھ ایسی ہی پیدا ہو چکی تھیں کہ انگلستان کا جنوبی حصہ اور لندن سخت خطرہ میں پڑ گیا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا حشر بھی وہی ہوگا جو آرمینیا یا رطڈم کا ہوا، لیکن برطانیہ کے عزم و ارادہ اور انگریز قوم کے صبر و تحمل نے ان تمام مصیبتوں کا نہایت پامردی کے ساتھ مقابلہ کیا اور رفتہ رفتہ اپنی فضائی قوت کو اس قدر مستحکم کر لیا کہ بجائے مدافعت کے خود بھی اس نے جرمن شہروں اور ساحلی مقامات پر حملے شروع کر دیے، حتیٰ کہ اکتوبر ۱۹۴۰ء تک جرمن حملے رفتہ رفتہ بہت کمزور ہو گئے اور ہٹلر کو یقین ہو گیا کہ وہ ہوائی تاخت سے انگلستان پر قابض نہیں ہو سکتا۔

افریقہ کی مہم

فرانس کی شکست کے چار مہینے بعد، مسوینی کو خیال پیدا ہوا کہ اگر اس وقت اس نے اپنی افریقی مقبوضات میں وسعت پیدا کرنے کی کوشش کی تو وہ ضرور کامیاب ہو جائے گا، کیونکہ فرانس اس کے مقابلہ میں آسکتا نہیں اور برطانیہ انگلستان کے بچاؤ میں اتنا مصروف ہے کہ وہ بھی زیادہ مزاحمت نہ کر سکے گا، چنانچہ اس نے یہ حملہ شروع کر دیا اور اس کی فوجیں، مصر، سوڈان اور کینیا کی حدود میں داخل ہو گئیں یہاں تک کہ برطانوی سومالی لینڈ پر بھی قبضہ کر لیا، یقیناً ان کامیابیوں سے مسوینی کی توقعات کو بہت بلند ہو جانا چاہئے تھا، لیکن تین مہینے بھی پوری طرح نہ گزرے تھے کہ مارچ ۱۹۴۱ء تک فاسستی حکومت افریقہ میں بالکل ختم ہو گئی اور مسوینی کی یہ تمنا کہ وہ سلطنت رومہ کی دیرینہ عظمت حاصل کر سکے پوری نہ ہو سکی۔

جس وقت دسمبر ۱۸۵۷ء میں برطانوی فوجوں نے، اطالویوں کے خلاف نقل و حرکت شروع کی تو مسولینی کی فوجیں کافی مضبوطی کے ساتھ مختلف مقامات پر قابض ہو چکی تھیں، لیکن وہ برطانوی حملہ کی تاب نہ لاسکیں۔ وسط دسمبر تک شدید برائی پر قبضہ ہو گیا، جنوری کے پہلے ہفتہ میں بریہ فتح ہو گیا اور چند دن بعد تبروک بھی۔ اس کے بعد، فروری تک بن غازی بھی اطالویوں کے ہاتھ سے نکل گیا اور اس کے دو دن بعد برطانوی فوجیں (Mackenzie - Baird) تک پہنچ گئیں جو مغربی سرحد کا بالکل آخری مقام تھا۔ اس کے پندرہ دن بعد معلوم ہوا کہ جرمن فوجیں مغربی لیبیا میں پہنچ گئی ہیں اور اس طرح مصر اور لیبیا کی سرحد پر پھر جنگ شروع ہو گئی، ہر چند اس جنگ میں بن غازی اور بعض دوسرے ساحلی مقامات برطانوی قبضہ سے نکل گئے، لیکن تبروک پر اب تک انگریزی فوجوں کا قبضہ ہے اور باوجود متواتر حملوں کے جرمن فوجیں یہاں کوئی کامیابی حاصل نہیں کر سکیں

ہم نہیں کہہ سکتے کہ آئندہ افریقہ کا کیا حشر ہوگا، لیکن یہ واقعہ ہے کہ فی الحال اطالوی اثرات افریقہ سے بالکل ختم ہو چکے ہیں۔ اریٹریا جو اطالیہ کی نہایت قدیم کالونی تھی وہ انگریزی قبضہ میں ہے، برطانوی سومالی لینڈ پھر برطانیہ کے ہاتھ میں پہنچ گیا ہے، اور عدیس آبابا میں پھر شاہ حبشہ کا جھنڈا لہرا رہا ہے

بلقان اور کربٹ بحر روم اور افریقہ میں ناکام رہنے کے بعد مسولینی نے یونان پر حملہ کر دیا۔ اسے یہاں بھی اپنی کامیابی کا یقین تھا، لیکن یونان نے نہایت جرات سے مقابلہ کیا اور اطالوی فوجوں کو البانیہ کی سرحد تک نکال دیا۔ اس لڑائی میں مسولینی کی فوجوں کو سخت نقصان اٹھانا پڑا اور یقیناً مسولینی کو البانیہ سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا اگر جرمن فوجیں اس کی مدد کے لئے نہ پہنچ جاتیں

جرمنی نے اول اول اطالیہ کی کوئی مدد نہیں کی، اس کے دو سبب تھے ایک یہ کہ وہ مسولینی کو بتانا چاہتا تھا کہ اطالوی فوجیں کس قدر کمزور ہیں اور اس طرح محور میں مسولینی کی شرکت، جرمنی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ اٹلی پر دباؤ ڈال کر وہاں اپنا اثر جمائے، چنانچہ وہ اس میں کامیاب ہو گیا۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ وہ بلقان میں قدم جانے کے لئے بلجاریا، ہنگری اور رومانیہ کی گتھیوں کو سلجھا رہا تھا اور اس طرف سے اطمینان حاصل کے بغیر وہ یونان کے معاملہ میں دخل دینا مناسب نہ سمجھتا تھا۔ جب اس نے دیکھ لیا کہ ادھر ہنگری اور رومانیہ بھی محور میں شریک ہو گئے ہیں اور دوسری طرف اٹلی پر کافی اقتدار قائم ہو چکا ہے تو اس نے یونان کا رخ کیا

ہر چند ابھی تک یوگوسلیویا کا معاملہ طے نہ ہوا تھا، لیکن ہٹلر کو یقین تھا کہ وہ بھی سربانی نہ کرے گا اور وہاں کی رکنیسی نے محور میں شرکت کا اعلان بھی کر دیا تھا مگر نوجوان بادشاہ پیٹر نے مخالفت کر کے اخیر وقت میں اس اسکیم کو کامیاب نہ ہونے دیا اور اپریل کو جرمنی نے یونان اور یوگوسلیویا دونوں پر حملہ کر دیا۔ ہر چند برطانوی فوجیں افریقہ کی طرف مصروف تھیں تاہم یونان کی مدد کے لئے ایک حصہ افواج کا ادھر بھی بھیجا گیا اور جرمن فوجوں کو کافی نقصان اٹھانے کے بعد کامیابی حاصل ہو سکی

یونان کے بعد جرمنی نے کربٹ پر حملہ کیا تاکہ یونانی حکومت کو یہاں سے بھی دور کر دے اور بحر اربعین پر قبضہ کر کے فلسطین اور نہر سوئز پر زیادہ قریب سے حملہ کر سکے۔ بعض کا خیال ہے کہ یوگوسلیویا اور یونان یقیناً یہ سمجھتے تھے کہ انھیں کامیابی نہ ہوگی

اس لئے ان کا مقابلہ کے لئے آمادہ ہو جانا کوئی معنی نہ رکھتا تھا، لیکن یہ خیال صحیح نہیں، کیونکہ اگر جرمنی کو یونان، یوگوسلیویا اور کریٹ میں جنگ نہ کرنا پڑتی تو شاید نقشہ جنگ اس وقت کچھ اور ہوتا اور غالباً جرمنی کے حق میں زیادہ مفید صورتیں پیدا ہو جاتیں۔ دشمن کے خلاف جنگی تدابیر میں سے ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اس کی راہ میں موانع پیدا کئے جائیں اور اس کی قوت کو کمزور و منتشر کیا جائے۔ اگر جرمنی کو یونان میں جنگ نہ کرنا پڑتی تو وہ اس وقت تک شام و عراق میں اپنے پاؤں جما چکا ہوتا اور مشرقی افریقہ میں پڑ جاتا۔

برطانیہ کا شام کی طرف اقدام اور عراق میں جرمن ریشہ دو انیوں کا سد باب، دونوں اسی لئے ممکن ہو سکے کہ یونان و کریٹ کے فتح کرنے میں جرمنی کو وقت و قوت دونوں کافی صرف کرنا پڑے جن سے بصورت دیگر وہ کسی محاذ میں کام لیتا اور ہو سکتا ہے کہ وہ محاذ روس ہی ہوتا۔

بحر اٹلانٹک جب جرمنی کو حملہ انگلستان میں ناکامی ہوئی تو اس نے چاہا کہ انگلستان کی ناکہ بندی کر کے اسے مجبور کر دے چنانچہ اس نے اٹلانٹک کے راستوں میں اپنی آبدوزوں سے حملے شروع کر دیے۔ اس میں شک نہیں کہ اسے امریکہ اور انگلستان کے درمیان تجارتی سلسلہ کو اس طرح کافی خطرناک بنا دیا اور برطانیہ کو بہت نقصان پہونچایا، لیکن انگریزوں کی بحری قوت اور ان کے بحری ذرائع اتنے وسیع ہیں کہ باوجود کثیر نقصانات کے بھی، برطانوی تجارت، برطانوی رسد رسانی اور سامان حرب کی فراہمی بدستور جاری ہے اور ہٹلر کی یہ اسکیم بھی کامیاب ہوتی نظر نہیں آتی۔

حملہ روس یونان و کریٹ فتح کرنے کے بعد یقین تھا کہ جرمنی، شام پر قبضہ کر لے گا، اور ٹھیک اسی وقت جبکہ دنیا اسی قسم کی خبریں سننے کے لئے طیارہ تھی، ترکی اور جرمنی کے درمیان ایک معاہدہ کی خبر آئی اور اس کے بعد ہی ۲۲ جون کو اس نے روس پر حملہ کر دیا۔

اس میں شک نہیں کہ موجودہ جنگ کا سب سے بڑا مسمم یہی ہے اور بظاہر کوئی وجہ اس حملہ کی نظر نہیں آتی، جبکہ روس اور جرمنی کے تعلقات اس وقت تک نہایت خوشگوار بلکہ دوستانہ چلے آ رہے تھے۔

جرمنی کی طرف سے جو اسباب اس حملہ کے بیان کئے گئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ روس خود جرمنی پر حملہ کی تیاریاں کر رہا تھا، لیکن بعض کا خیال ہے کہ یہ ہٹلر کا صرف بہانہ ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ حملہ انگلستان کی ناکامی کے بعد اپنی فوجوں کو کسی نہ کسی طرف لگائے رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ وہ کسی دوسری طرف ان کا رخ متعین کرنا اور رومانیہ و بلغاریہ وغیرہ کی شرکت کی وجہ سے اس کے لئے زیادہ آسانی اسی میں تھی کہ وہ روس ہی کو نشانہ بناتا۔

۲۲ جون کو اس نے روس پر حملہ کیا، اس اعلان کے ساتھ کہ دس ہفتے کے اندر اس مہم کو ختم کر دے گا، لیکن ہٹلر اس میں بھی حملہ انگلستان کی طرح (جس پر قبضہ کرنے کی تاریخ اس نے ۱۵ اگست ۱۹۱۴ء مقرر کر دی تھی) ناکام رہا، کیونکہ ۹ ہفتے ختم ہو جانے کے بعد بھی وہ ابھی تک روس کے کسی صوبہ پر بھی پورا قبضہ نہیں کر سکا۔

اس لڑائی کا محاذ خلیج فن لینڈ سے لیکر اوڈیسہ تک پھیلا ہوا ہے جو دو ہزار میل سے کم نہیں، اور غالباً تاریخ کی یہ سب سے پہلی جنگ ہے جو اتنے بڑے میدان میں اتنی کثیر فوج کے ساتھ لڑی گئی ہو۔

جرمنی کے ساتھ رومانیہ، ہنگری، اٹلی اور فن لینڈ شامل ہیں اور برطانیہ و امریکہ روس کی مدد کر رہے ہیں۔

جرمنی کہتا ہے کہ یہ لڑائی بالشویزم کو دنیا سے ختم کر دینے کے لئے لڑی جا رہی ہے، جمہوری حکومتیں کہتی ہیں کہ اس وقت دنیا کے لئے سب سے بڑا خطرہ ناسیت ہے، اس لئے سب سے پہلے اسے ختم ہونا چاہئے اور اسی لئے وہ روس کو مدد پہونچا کر جرمنی کو شکست دینا چاہتی ہیں

اس جنگ کو شروع ہی سے سیاسی اصول و عقاید کی جنگ کہا جاتا ہے، لیکن اب جرمنی و روس کی آویزش نے واقعی اس کو یہی حیثیت دیدی ہے اور اس میں شک نہیں کہ اگر جرمنی، روس کو مغلوب کرنے میں کامیاب ہو گیا تو ناسیت سارے یورپ پر چھا جائے گی اور اگر روس نے جرمنی کو ہرا دیا تو اشتراکیت کو بڑی تقویت پہونچے گی، لیکن اگر کسی تیسری یا حسن اتفاق سے یہ دونوں قوتیں آپس ہی میں ٹکرا کر ختم ہو گئیں، تو بیشک اس کے بعد جمہوریت کا ایک نیا دور شروع ہو گا اور ممکن ہے کہ یہ اسوقت کی تمام حکومتی نظاموں کا نچوڑ ہو

اس وقت جرمنی و روس کا محاذ تین حصوں میں منقسم ہے، ایک شمالی، دوسرا وسطی اور تیسرا جنوبی۔ شمال کی طرف اسوقت زیادہ زور ہے اور خلیج فن لینڈ کے ساحلوں پر جرمن تسلط نے لینن گراڈ کو سخت خطرہ میں مبتلا کر دیا ہے درمیانہ حصہ میں ناسی فوجیں ابھی تک بارش ہو جانے کی وجہ سے اسمولنسک سے آگے نہیں بڑھ سکیں اور اس طرح فی الحال اسکو خطرہ سے دور ہے، جنوب میں البتہ ۱ و کرائن کے بڑے حصہ پر ناسی قبضہ ہو گیا ہے اور اوڈسیہ جو بحر سیاہ کا نہایت اہم روسی بندرگاہ ہے چاروں طرف سے گھیر گیا ہے۔ لیکن باوجود ان تمام اقدامات کے ناسی فوجیں ابھی تک مغربی روس کے پانچویں حصہ کو بھی طے نہیں کر سکیں اور موسم سرما کے آغاز تک اس جنگ کا اختتام کسی طرح ممکن نہیں در احمالیکہ ٹٹلر کی سب سے بڑی تمنا یہی تھی

اس جینے کا سب سے زیادہ اہم واقعہ یہ تھا کہ روس و برطانیہ نے ایران میں فوجی پیشقدمی کر کے اس کی شمالی اور **ایران** جنوبی مغربی سرحد پر قبضہ کر لیا۔ اس پیشقدمی کے آثار اسی وقت ظاہر ہو گئے تھے جب برطانیہ کو ایران کی طرف سے یہ شکایت پیدا ہو چلی تھی کہ وہاں جرمن اثرات بڑھتے جا رہے ہیں اور ایران کے اکثر محکموں میں ناسی افسران برطانیہ کے خلاف ریشہ دوانیاں کر رہے ہیں

چونکہ شاہ ایران نے برطانیہ کے اس احتجاج کا جواب زیادہ اطمینان بخش و موثر لہجہ میں نہیں دیا۔ اس لئے نازی خطرہ کو دور کرنے کے لئے روس و برطانیہ دونوں نے یہ فوجی کارروائیاں کیں

اس کارروائی کا مقصد یہ ہے کہ کاکیشیا کی طرف سے جرمنی کے حملہ کے امکان کو ختم کر دیا جائے اور ایران کے پٹرولی چشموں کو اس کی دسترس سے دور رکھا جائے، چنانچہ برطانیہ اور روس نے ایران کے جن جن حصوں پر قبضہ کر لیا ہے، ان سے اب یہ خطرہ دور ہو گیا ہے

ایران پر یہ قبضہ عارضی قبضہ ہے اور جنگ ختم ہونے کے بعد اس کو بھی ختم ہو جانا ہے، چنانچہ ایران کی موجودہ وزارت نے رضا شاہ پہلوی کی رضامندی سے ان تمام شرائط کو تسلیم کر لینے کا ارادہ ظاہر کیا ہے جو اس حفاظتی کارروائی سے متعلق ہیں اور اب وہاں بالکل امن و سکون ہے۔

ترکی - اس دوران میں یہ خبریں بھی سننے میں آئی ہیں کہ بلغاریا اور سالونیکا کی طرف (ترکی کی سرحد پر) جرمن دھاتوبازی

فوجوں کا زبردست اجتماع ہو رہا ہے، اسی کے ساتھ ترکی و جرمنی کے بعض ارباب سیاست کی نقل و حرکت بھی سننے میں آرہی ہے، جس سے اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر جرمنی کو روس میں ناکامی ہوئی، تو غالباً وہ ترکی کی طرف سے عراق و ایران پہنچنے کی کوشش کرے گا، کیونکہ اس وقت جرمنی کو سب سے زیادہ ضرورت پٹرول کی ہے اور اسی لئے وہ عراق، ایران اور باکو کے پٹرولی چشموں تک پہنچنے کے لئے بیتاب ہو رہا ہے

اگر ایسا ہوا تو ترکی کیا رویہ اختیار کرے گا، اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا، لیکن بظاہر توقع یہی ہے کہ وہ اپنے ملک سے ناقصی فوجوں کو گزرنے نہ دے گا اور مہلک کی راہ میں ترکی ایک زبردست پتھر ثابت ہوگا

جرمنی کا روس پر حملہ کرنا، ایسی معمولی بات نہ تھی کہ جاپان اس سے متاثر نہ ہوتا۔ ہرچند حال ہی میں وہ روس سے مصالحت کا معاہدہ کرچکا ہے، لیکن ایسے پرانے دشمنوں کا معاہدہ ہی کیا۔ چنانچہ جرمنی حملہ کے ساتھ ہی جاپان نے بھی پھریری لی اور فرانسیسی انڈوچائنا کے عضو ضعیف پر یہ نزلہ گرا

جاپان، انڈوچائنا اور سیام دونوں پر عرصہ سے دانت جمائے ہوئے تھا اور جرمنی کے ساتھ دوستی کا فائدہ وہ اس طرح اٹھانا چاہتا تھا کہ ان دونوں ملکوں پر تسلط قائم کر لے، چنانچہ روس پر حملہ ہوتے ہی، اس نے انڈوچائنا کی طرف فوجی اقدام شروع کر دیا اور کامیاب ہو گیا، کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ اول تو وشی حکومت میں اتنی قوت نہیں کہ وہ اس کی مخالفت کرے گی، اور اگر ایسا ہوا بھی تو جرمنی کا دباؤ اسے روک دے گا، بہر حال، جاپان نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر انڈوچائنا لے لیا اور اب سیام پر بھی قبضہ کرنا چاہتا ہے

جاپان کی اس پالیسی کے خلاف برطانیہ اور امریکہ نے مضبوط قدم اٹھایا ہے، یعنی سب سے پہلے تو اس کا تمام سرمایہ جو برطانوی مقبوضات اور امریکہ میں پایا جاتا تھا، ضبط کر لیا گیا، دوسرے تو ہا اور پٹرول وغیرہ کی برآمد جاپان میں بند کر دی گئی، اسی کے ساتھ برطانیہ نے سنگاپور میں اور امریکہ میں فلپائن میں زبردست فوجی طیاریاں شروع کر دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاپان کالب و لہجہ بھی نرم پڑ گیا اور اب امریکہ کو یقین دلایا ہے کہ اس کا مقصد جنگ کرنا نہیں ہے۔ تاہم جاپان کا رویہ قابل اطمینان نہیں ہے اور وہ لڑائی کا رخ دیکھ رہا ہے، اگر اس کو جرمنی کی کامیابی کا یقین ہو گیا تو وہ بلا شک و شبہ منچو کو کی طرف سے سائبیریا پر حملہ کر دے گا اور ہندو گاہ و لاڈی و اشک پر قبضہ کرنا چاہے گا، جس کی تمنا اسے عرصہ سے ہے، لیکن اگر اس نے دیکھا کہ پلہ برابر ہے یا روس کامیاب ہو رہا ہے، تو وہ پھر اور زیادہ دب کر برطانیہ و امریکہ سے گفتگو کرے گا اور ہو سکتا ہے کہ اس سلسلہ میں انڈوچائنا پر بھی اس کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے۔

میں ۱۳ ستمبر کو شہر جا رہا ہوں

اور اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں واپس آؤں گا، اس لئے ممکن ہے کہ اکتوبر کا پرچہ آٹھ دس دن کی تاخیر سے شائع ہو۔ اس دوران میں مجھ سے براہ راست مراسلت کا پتہ یہ ہوگا :-
ذریعہ پوسٹ ماسٹر سمری نگر
نیاز فچپوری

محمودی رسم خط پر تبصرہ

گزشتہ مارچ کے نگار میں محمود علی خاں صاحب بی۔ اے کا مقالہ بعنوان ”اردو کا نیا رسم الخط“ شائع ہوا ہے، اس پر میں بھی اپنی ناچیز تنقید اہل نظر کے غور کے لئے پیش کرتا ہوں:

ابتداء میں یہ عرض کرنا ہے کہ مقالہ مذکور میں رسم الخط کے الفاظ ہر جگہ صنفِ کتابت کے معنی میں استعمال ہوئے ہیں، درغالب اس کے لئے صرف لفظ خط ہے۔ رسم الخط عربی میں لفظ کے وہ معین حروف ہیں جن میں تصرف کرنے سے اس کی کتابت غلط مانی جاتی ہے، یا کسی خاص کتاب یا شخص کا غلط یا صحیح مخصوص طرز کتابت الفاظ میں خط اور رسم خط کو انہیں معنی میں استعمال کروں گا۔ چونکہ خط زیر نظر قوم حسابی سے بہت زیادہ مماثلت ہے اس لئے میں بنظر اختلاف، خط غبار و خط گلزار وغیرہ کے قیاس پر اسکا ذکر ”خطِ رومی“ کے نام سے کروں گا۔ یا پھر محمودی رسم خط سے۔

صاحب مقالہ کی رائے میں عہدِ حاضر کی سرعت طلب ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اردو خط کی موجودہ صورت ٹائپ میں منتقل نہیں ہو سکتی۔ ان کی رائے میں (۱) اشکال کا پیچیدہ اختلاط اور ان کی کثرت (۲) خط کی ترکیبی صورت۔ (۳) حرکات کا محض قیاس اور سیاق عبارت سے پڑھا جانا اور (۴) وغیرہ امور ہیں جو اس میں مانع ہیں۔ وغیرہ وغیرہ سے جو تقاضے مراد ہیں وہ تو سوچنے سے ذہن میں نہیں آتے اور اس میں بھی عقل کام نہیں کرتی کہ حرکات کے قیاس اور سیاق عبارت سے پڑھے جانے کو خط کے ٹائپ میں منتقل ہونے کی صلاحیت سے کیا لگاؤ ہے اس لئے ان وجوہ کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اب رہ گئے اسباب اول و دوم، تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ بھی سدرہ نہیں ہوئے۔

حیدرآباد کے اہل ہمت نے اور ان سے پہلے اوروں نے بھی ان کو نسخہ کر کے دکھا دیا ہے۔ اگر ان کے طیار کئے ہوئے ٹائپ نے رواج نہیں پایا تو اس کے اسباب کچھ اور ہونے چاہئیں۔ ساخت کو رواج سے کوئی واسطہ نہیں۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سابق اجلاس کلکتہ میں وہاں کے اعیان میں سے ایک صاحب نے اعلان کیا تھا کہ انھوں نے نستعلیق کا یہاں عمدہ ٹائپ طیار کر لیا ہے۔ اس سے اگلے سال اجلاس پٹنہ میں بھی ایک صاحب نے یہی اعلان کیا۔ البتہ ان کا ثمرہ محنت ابھی منصفہ ظہور پر نہیں آیا۔ خط نسخ میں بھی وہی پیچیدہ و کثیر اشکال ہیں اور وہی ترکیبی صورت ہے۔ لیکن اس کا ٹائپ اندرون و بیرون ہند کام دے رہا ہے۔ ان باتوں کے ہوتے ہوئے یہ دلائل پیش کرنا بدیہیات کا انکار ہے۔

بالفرض اگر نستعلیق کے رواج کی طرف سے ہمیشہ کے لئے مایوسی ہو چکی ہے تو اس سے قریب تر خط نسخ ہے یا یہ خطِ رومی؟ خطِ رومی کو پیش کرنے کے ساتھ صاحب مقالہ کو یہ واضح کرنا بھی ضروری تھا کہ نسخ بھی اردو کے کام کا نہیں ہے، لیکن اس کے متعلق انھوں نے

ایک حرف بھی نہیں فرمایا۔ نستعلیق سے قریب ترین اور نہایت خوشنما ہونے کے علاوہ یہ خط ہندوستان میں کسی پڑھے لکھے کے لئے اجنبی و غیر مانوس نہیں ہے۔ مڈل سے شروع کر کے امتحانات کے پرچے، سرکاری گزٹ، بہت سے سرکاری و غیر سرکاری کاغذات و اشتہارات اسی میں چھاپے جاتے ہیں۔ خط قومی مقابلہ بہت زیادہ متغیر ہے اور اس کے اختیار کرنے سے ہمارا رشتہ خط ماضی سے فی الجملہ منقطع اور آج تک کا کل ذخیرہ کتب مفت میں بیکار ہو جائے گا۔ اگر نسخ بھی کام نہیں دے سکتا تو بدرجہ اخیر ہم موجودہ خط کو خط قومی سے بہتر صورت میں استعمال کر سکتے ہیں جو میں بتاؤں گا۔

موجودہ خط کے ذریعے سے تعلیم دینے کی مشکلات پر مقالہ نگار نے بہت زیادہ زور دیا ہے اور یہاں تک غلو کیا ہے کہ بالغوں کی تعلیم تو اس کے ذریعے سے کسی طرح ممکن نہیں، حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے ذریعے سے ان کی تعلیم ہو رہی ہے۔ کوئی خط ہو اس کی مشکل اور آسانی میں بچے اور بوڑھے اور اجنبی برابر کے شریک ہیں۔ وقت اگر نسبتاً زیادہ صرف ہوتا ہے، تو اس کا الزام اصل خط پر عاید نہیں ہوتا، اس کی مستقل صورت پر ہوتا ہے۔

اب محمودی رسم الخط کی خصوصیات کو دیکھنا چاہئے جن کی بنا پر اس کو نستعلیق پر فوقیت دی گئی ہے:

(۱) حروف کا انفصال مثل ہندی و رومن حروف کے۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان کے ڈھالنے میں تقریباً اتنی ہی سہولت ہوگی جتنی روم حسابی کے ڈھالنے میں اور ٹکڑوں کی تعداد خاص طور پر کم رہے گی، لیکن اس انفصال میں نفع سے زیادہ نقصان ہو جس خط تو بالکل رخصت ہو جائے گا۔ اور پڑھنے کی آسانی گھٹ جائے گی۔ ہمارے الفاظ مجموعہ حروف سے زیادہ تصویریں ہیں۔ یہ تصویریں شان بغایت قابل قدر چیز ہے۔ اس کی وجہ سے جو پڑھنے میں آسانی ہوتی ہے اس کا امتحان کر کے دیکھئے۔ ایک ہی عبارت تینوں خطوں میں لکھ کر تین اچھے پڑھنے والوں سے پڑھوائیے اور دیکھئے کون پہلے ختم کرتا ہے۔ ترکیبی الفاظ پر نظر مجتمع رہتی ہے اور تفصیلی پر پھیلتی اور دیر میں ان کو اخذ کرتی ہے۔ فی الحقیقت تفصیل کوئی قابل تمنا چیز نہیں ہے، بدرجہ مجبوری اس کو اختیار کیا جاسکتا ہے۔ اگر کوئی تدبیر ایسی ہو سکتی ہے جس سے حصول مقصد کے ساتھ خط کی صفت ترکیبی بھی زیادہ سے زیادہ حد تک باقی رہے تو وہ بیشک قابل ترجیح ہوگی۔

۲- دائروں کا حذف۔ موجودہ خط کے مقابلے میں یہ جدت بہت بھونڈی ہے۔ ہمارے موجودہ دائرے اور کشش کے فائدے کو نہیں سمجھا۔ دائرے اور کشش کے ساتھ حروف ہمیشہ لفظ کے آخر میں آتا ہے اور یہ اس کے اختتام کی خبر دیتے ہیں۔ انھیں کی مدد سے گنجان سے گنجان عبارت میں لفظ کا اپنے مابعد سے الگ پڑھ لیا جانا ممکن ہوتا ہے۔ محمودی رسم خط کے جو نمونے رسالے میں چھپے ہیں ان کو دیکھئے، سطور کیا ہیں پر پڑے میدان میں فوجی سپاہیوں کی بے رخنہ صفیں ہیں۔ میں تو ان کو نستعلیق ہی کی مدد سے پڑھ سکا۔ موجودہ خط میں وہی حروف تکلیف دہ ہیں جو دائرہ و کشش سے عاری ہیں اور اپنے مابعد سے نہیں ملتے۔ اس جدید خط میں دائرے اور جوڑ پیوند دونوں کو علیحدہ کر دیا گیا ہے، لیکن حذف دائرہ و کشش کے بعد کوئی چیز باقی رہ جاتی ہے جس کا نام جوڑ اور پیوند رکھا جاسکے؟ ایک کے بعد دوسرا فوراً شروع ہو جاتا ہے۔

۳- حروف کے ساتھ ایک ٹنڈی کی وساطت سے حرکات کا وصل۔ وصل حرکت کے مقصد سے کسی خارجی اضافہ کرنے کیلئے ضروری تھا کہ پہلے دونوں کے وصل کی ضرورت ثابت کی جاتی۔ حرکات کے بارے میں انھوں نے جو کچھ فرمایا ہے اس سے ان کے وصل کی ضرورت

نہیں ثابت ہوتی، استعمال کی ثابت ہوتی ہے اور اس سے کسی کو افکار نہیں ہو سکتا۔

حرکات کو حروف کے ساتھ جوڑ دینے سے جناب موجد کا مقصد اس کے سوا نہیں کہ وہ اضطراراً استعمال ہوں گی لیکن موجودہ خط میں اعراب موجود ہیں انہیں کو کیوں نہ استعمال کیا جائے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ وہ مقابلے کے لئے موجودہ خط کو تو بغیر اعراب کے لکھتے ہیں اور اس کی قافی کی شکایت کرتے ہیں اور اپنے خط کو مع اعراب لیتے ہیں۔

حرکت کو حرف کا جزو بنانے سے موجد کا غالباً یہ مطلب نہیں ہے کہ اصل حرف اور ڈنڈی اور حرکت تینوں ڈھلیں گے یہی مجتمع صورت میں، کیونکہ اس صورت میں ہر حرف چار قسم کا بنانا لازم ہوگا، اگر یہ نہیں تو بقیہ صورتوں میں سے ہر صورت میں حرکت الگ ڈھلے گی، تو پھر ڈنڈی سے کیا فائدہ۔ مروج طریق پر الگ ہی کیوں نہ لگائی جائے۔

رسم الخط - اس میں دو طرح کے امور ہیں، ایک وہ جو محمدی رسم خط کے ساتھ خاص ہیں اور دوسرے وہ جو اس میں اور موجودہ خط میں مشترک ہیں اور ان کا ذکر موجد نے صراحت سے کیا ہے یا نہیں کیا ہے۔

خاص: ان میں بعض کا ذکر صراحت سے کیا گیا ہے اور بعض صرف مثالوں سے مستنبط ہوتے ہیں۔ صراحت کے ساتھ تین چیزوں کو حذف کیا گیا ہے۔ تشدید، ہمزہ وصل، لام تعریف۔ مثالوں میں یہ باتیں پائی جاتی ہیں: (۱) حذف واو عطف (۲) حذف واو "معدولہ"۔ (۳) ہمزہ کے طریق کتابت میں انقلاب۔ (۴) ہائے مختفی کا کہیں حذف کہیں ابقا۔ (۵) اصول اگرچہ کتابت "مطابق تلفظ" کا اختیار کیا گیا ہے لیکن نظم میں جہاں مد کا قصر آیا ہے حرف مدہ کو حذف نہیں کیا گیا اور جہاں حرکت کا مد آیا ہے حرف مدہ کا اضافہ نہیں کیا گیا۔ مثلاً پہلے ہی شعر میں اپنے کو اپن، ہے کوۃ اور کشور کو کشور لکھنا چاہئے تھا۔ اس سے "کوئی لفظ ہرگز غلط نہیں پڑھا جاسکتا" کا دعوے قائم نہیں رہتا۔ اختیار کردہ اصول کے مطابق بظاہر ابجد سے وہ حروف خارج ہوئے چاہئے تھے جن کے حذف میں آپ کو حرا ہے، لیکن ان کے قائم رکھنے کے لئے وجہ بتائے گئے ہیں، لہذا ان کو مستثنیٰ سمجھنا چاہئے۔

موجودہ رسم خط میں ہر چیز کسی نہ کسی اصول اور وجہ سے ہے۔ جب اس میں تغیر کیا جائے تو لازم ہے کہ دلائل دی جائیں اور بتایا جائے کہ اس کے ترک سے کوئی قباحت لازم نہیں آتی اور اگر آتی تھی تو اس کا اس طرح تدارک کیا گیا ہے، ہمزہ وصل کو لیجئے۔ سوال یہ ہے کہ اس کو قدمائے رکھا کیوں تھا۔ دوسری چیز لام تعریف ہے۔ اس کو حذف کرنے کے ساتھ یہ بھی بتانا چاہئے تھا کہ اب اس کی بجائے حرف تعریف کیا رکھا گیا ہے۔ آیا اب باوجود تعریف کلمہ کے، زبان سے حرف تعریف معدوم مانا جائے گا، یا بقیہ حروف کسی میں سے ہر ایک کو یہ منصب حاصل ہوگا۔ یہاں کتابت کے ساتھ زبان کا سوال بھی لگا ہوا ہے۔ اصلاح کے ساتھ یہ بات بھی لحاظ رکھنے کے قابل تھی کہ اردو کے مصلح کو عربی کی حدود میں قدم رکھنے کا حق نہیں ہے۔ یہی سوال واو عطف کے متعلق پیدا ہوتا ہے۔ کیا اس کی جگہ زبان میں معطوف علیہ کے ضمہ اخیر کو دی گئی ہے۔ اس قسم کی اصلاحات یوں خاموشی سے عمل میں نہیں لائی جاسکتیں۔

واو مخلوط۔ اس کی مثالوں میں بوا، ہوا، جوا پہلا حرف مضموم اور تیسرا الف مدہ ہے، لہذا دوسرا یقیناً مفتوح ہے۔ اگر وہ واو ہے تو واو متحرک کو کس خصوصیت کی وجہ سے مخلوط کا لقب دیا جائے گا۔ دراصل یہ ہمزہ ہے اور اس پر شناخت کے لئے ہر وجہ بہم مقررہ سرعین بنانا چاہئے۔ بوا اور جوا، ہندی میں بوا اور جوا بھی ہیں۔ اس صورت میں واو ظاہر ہے کہ مدہ ہے۔

دھوپ، چچاں، مجھے، ٹھیک وغیرہ الفاظ میں ایک بات خاص مصلح سے دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ ان میں ء ساکن

لکھی گئی ہے اور اس کے ماقبل کو حرکت دی گئی ہے تو بلا امکان نزاع تک وہ، چہ، ٹچہ، بن گئے۔ اب وہ کے بعد جو حرف پڑتا ہے وہ وہ ہر مثال میں مدہ ہے، وہ کس حرکت کو مدد دے رہا ہے؟ حرکت مدہ سے پہلے حرف کی ہوا کرتی ہے۔ دوسروں کے خلاف ان کے حروف تہجی میں حروف مرکب تو ہیں نہیں جس سے یہ سمجھا جائے کہ وہ وہ اور اس کے ماقبل کو ملا کر ایک صورت بسیط کی علامت سمجھتے ہیں۔

ہاں یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ ہا کی تین صورتیں کس مصلحت سے داخل ابجد کی گئی ہیں، حالانکہ اس اور شش کی بھی دوسری صورت تھی جو شامل نہیں کی گئی۔ کیا ان تینوں کے استعمالات بلحاظ صورت خاص خاص ہیں؟

یہ بھی کوئی کہنے کی بات تھی کہ وہ انگریزی الفاظ بھی جن کی ابتدا ساکن حرف سے ہوتی ہے، محمودی رسم خط میں نہایت آسانی سے لکھے جاسکتے ہیں، کیا اس سے یہ مراد ہے کہ موجودہ خط میں یہ بات ممکن نہیں؟ کیا علامت سکون بنا دینے سے سٹیشن کا سین ساکن نہیں ہوگا؟ اظہار سکون علامت سے زیادہ واضح ہو سکتا ہے جو موجودہ خط کی خصوصیت ہے یا بغیر اس کے؟ حرف میں سکون و حرکت کے اخفا و عدم اخفا کا اصولی فرق اوپر آچکا ہے۔ پھر کیا ایسے الفاظ انگریزی ہی میں ہیں، ہماری زبان میں نہیں؟ ابھی معلوم ہوگا۔

امور مشترک: واو و یائی معروض و مجہول۔ ان کے ذکر خیر سے فارسی اور اردو قواعد کی کوئی کتاب خالی نہیں۔ انجن ترقی اردو نے ان کو حروف تہجی میں مستقل جگہ دی ہے اور تقلید ابھی ہمارے مصلح نے کیا ہے۔ ان کی حقیقت مندرجہ ذیل بحث سے واضح ہوگی۔

زبان اردو کی حرکات پر اب تک کسی نے توجہ نہیں کی۔ قواعد کی سب کتابیں اس سے خالی ہیں۔ اس لئے جو کچھ میں یہاں لکھونگا وہ بالکل نئی بات ہے، اردو میں قصیر حرکتیں چھ ہیں۔ انگریزی میں یہ سب جداگانہ حرکتیں شمار ہوتی ہیں اور ہر ایک مختلف طریقوں سے ظاہر کی جاتی ہے۔ مشترک طریقے بھی ہیں۔ اردو میں دو، دو کے لئے ایک ہی علامت ہے اس لئے ان کو ایک ہی کی فرع سمجھنا چاہئے۔ دو فرعیں زیر کی، دوزیر کی، دو پیش کی۔ زیر کی حرکتوں کو مدد دینے والی علامت مشترک ہے، اور اسی طرح پیش کی حرکتوں کو مدد دینے والی بھی مشترک ہے۔ زیر میں یہ صورت نہیں۔ علامتیں مختلف ہیں۔ میں نے ان کے فرعی نام ان کی حقیقت کے مطابق تجویز کئے ہیں۔ لیکن ہر ان سے بہتر نام تجویز کئے جاسکیں۔

فتح: (۱) مستقیم۔ اب۔ کم۔ دس۔ (۲) مائل۔ رہنا۔ کہنا۔ رحمت۔ زحمت۔ زہر۔ بہن۔ محل۔ صحرا۔

کسرہ: (۱) ثقیل (معروض)۔ دل۔ جس۔ کن۔ (۲) خفیف (مجہول)۔ یہ۔ بہتر۔ دہلی۔ فحنت۔ صحت۔ معمار۔ سہرا۔

ضمہ: (۱) ثقیل (معروض)۔ نعل۔ تم۔ چپ۔ (۲) خفیف (مجہول)۔ وہ۔ عہدہ۔ نہل۔ شہرت۔ محکم۔ محسن۔ معتد۔ رعب۔

تلفظ کے متبع سے معلوم ہوگا کہ قسم ثانی کی حرکتیں زیادہ تر ہائے ہوز، حائے حطی اور عین کے قبل آتی ہیں اور اسی وقت یہ حروف زیادہ تر ساکن ہوتے ہیں۔ یہ حرکتیں کم کم دوسرے حروف کے قبل بھی آتی ہیں، جیسے علما، شہداء وغیرہ عربی جمعوں کے حروف اول میں پیش فارسی مضافات کے آخر میں زیر۔ اسی طرح اور مثالیں مل سکتی ہیں۔ لیکن حروف مذکورہ جب ساکن ہوں تو ان کے قبل ہمیشہ یہی حرکتیں آتی ہیں۔ باقی حروف کو قسم اول کی حرکتوں سے خصوصیت ہے۔

ان حرکتوں کو جب مدد دینا ہو تو ہر دو قسم کسرہ کے بعد آتی اور ہر دو قسم ضمہ کے بعد آتے ہیں۔ اسی واسطے اس استعمال کے اعتبار سے ان کا نام مدہ ہے۔ آپ نے ان کا ذکر حروف علت کے نام سے کیا ہے لیکن ان کا یہ نام بہ اعتبار اس کے ہے کہ تصریف کلمات میں ساقط ہوتے ہیں۔ کمزور ہیں، اپنی اس کمزوری کی وجہ سے یہ نام پایا ہے۔ مدہ ہونے کی صورت میں تو حرکت ماقبل موافق ہوتی ہے۔

اور جب ناموافق ہو تو ان کو لین کہتے ہیں۔ مدہ اصطلاحاً ساکن ہیں اور ان کا قدیم رسم الخط علامت سکون کے ساتھ بھی ہے اور یہ بھی کہ بلا علامت کالی لکھے جائیں۔ فتحہ مستقیم کو مدینے کے لئے اس کے بعد الف لاتے ہیں لیکن فتحہ مائل کی درازی یا سے ہوتی ہے۔ یہ مدہ نہیں، لین ہے، لیکن اس کی آواز کو بھی جہاں تک چاہیں بڑھا سکتے ہیں، جیسے گے، ہے میں۔ اس لئے میں نے اس کا نام یای لین مشابہ مدہ رکھا ہے۔

غرضیکہ یہ چھ حرکتیں ہیں۔ ان کے نام بھی اور نشان بھی الگ ہونے ضروری ہیں، بغیر نشان کتابت میں زبان کی صحیح ترجمانی نہیں ہو سکتی۔ لیکن اب تک نہ سب کے امتیازی نام رکھے گئے ہیں اور نہ صنف ثانی کے لئے علیحدہ علامتیں، نہ رسم قدیم میں، نہ کسی رسم جدید میں۔

مدینے کے لئے یا ہر دو قسم کسرہ میں مشترک ہے۔ ایک کے بعد کوئی مخصوص عمل ببقا بلکہ دوسری کے نہیں کرتی، لہذا مدہ کے سوا کسی دوسرے نام کی محتاج نہیں۔ اسی بنا پر کتابت میں بھی کسی ایک کے بعد امتیازی نشان کی محتاج نہیں۔ اسی طرح واو۔ لیکن اس سب کے باوجود امتیازی نام و نشان انھیں کو دئے گئے ہیں۔ اس تقریر سے واضح ہے کہ معروف و مجہول واو اور یا کی اصطلاحیں سراسر لغو ہیں۔ کیفیت کا سارا فرق حرکت میں ہے، اسی کو دیکھ کر حروف کا تلفظ متعین ہونا چاہئے مدہ محض اشارہ مدہ ہے، حرکت کے اختلاف کیفیت میں اس کو مطلق دخل نہیں۔ یہ اصطلاحیں اگر جاری رکھی جائیں تو پھر ان کے مستحق حروف مدہ تو اپنے اشتراک کی وجہ سے بالکل نہیں ہیں، وہ حروف ہیں جو ہر قسم کسرہ و ضمہ کے بعد بالخصوص آتے ہیں۔

اصطلاح میں تو سمجھتی ہے، لیکن کتابت میں رنگارنگی ہے فتحہ مائل کا مذکور تو کسی رسم الخط میں نہیں ہے۔ معروف و مجہول کے معاملے میں پنجاب کے رسم میں حروف میں کوئی امتیاز نہیں ہے، جیسا کہ نہ ہونا چاہئے، لیکن وضع علامت سے جان بچا کر مجہول کے ماقبل کو ہل چھوڑ دیا گیا ہے۔ اوروں میں سے بعض نے حرکت میں امتیاز کیا ہے اور حروف میں نہیں کیا لیکن عمل میں وہ حرکت غلطی سے آگے کو سرک کر حروف پر مدہ چلی گئی ہے بعض نے دونوں میں امتیاز روا رکھا ہے، بعض نے حروف کو امتیازی نشان دیکر حرکت ماقبل سے قطعاً نیاز دے تعلق کر کے اس کو ابجد کا ایک مستقل حرف ہی بنا دیا ہے۔ گویا بخلاف ان حروف کے جن کے بعد مدہ نہیں ہے ماقبل مدہ خالی ہے، نہ متحرک نہ ساکن، اور حرکت مدہ میں جذب ہو گئی ہے۔ وضع خط کے اصول کے مطابق مدہ کو دور کرنے کے بعد حروف کو متحرک بحکمت قصیر باقی رہنا چاہئے۔ لیکن اس نظام میں مدہ دور کر دینے سے وہ حرکت ہی باقی نہیں رہتی جس کو مدہ دیا تھا اور یہ خلل واقع ہے۔ غرضکہ امتیاز آنا کی یہ تمام چہل پہل حروف مدہ کے مرکز کے ارد گرد ہوتی ہے، باقی بیچ۔

ادب کی تصریحات کے بموجب اردو کا قدیم حقیقی نظام حرکات حسب ذیل ہے جس میں حرکات قصیر کی علامات مشترک ہیں:

نام	قسم	قصیر	مدید
فتحہ		ـَ	ـِ
کسرہ		ـِ	ـِ ی ـِ
ضمہ		ـُ	ـُ و

اور فتحہ مائل مدید کو شامل کر لیجئے تو ـِ سے بھی قصیر مشترک۔

نقشے سے ظاہر ہے کہ اردو کا نظام حرکات نہ ہندی سے مشابہ ہے، نہ رومن سے۔ ہندی میں بہ استثنائے فتح کے اس کو آواز کے ساتھ حرف ہی میں رکھا گیا ہے جملہ حرکات قصیر و مدید حروف سے جدا علامات سے ظاہر کی جاتی ہیں اور رومن میں سراسر حروف ہے۔ اور وہ حروف ہمزہ متحرک کا کام بھی دیتے ہیں۔ لیکن اردو میں مخلوط طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ حرکات قصیر کے لئے جدا علامات ہیں اور حرکات مدید کے لئے ان پر ان کے متجانس حروف کا اضافہ کر دیا جاتا ہے اور ان کی اخوات کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ ان کا دوسرا استعمال ہے۔ اب آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اردو میں ہندی کی طرح لہجی حرکتوں کی علامات کے اضافے کی ضرورت ہے یا نہیں۔ اگر آپ کے مشورے کے مطابق بڑھائی جائیں تو لامحالہ ہر لفظ میں سے حروف مد کو نکال کر بڑھائی جائیں گی بظاہر تو علامات کی ضرورت مندرجہ بالا حرکات قصیر کیلئے ہے۔ میں نے ان کے لئے علامات مقرر کی ہیں اور قدیم استعمالات کو مد نظر رکھتے ہوئے موجودہ علامات ہی رُخ بدل کر اختیار کر لی ہیں موجودہ علامتیں پہلے سے ثقیل قسم کے لئے ہیں۔

نکتہ - یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ جن تین علامات کی کمی اردو میں ہے انہیں کی ہندی میں بھی ہے۔ ہندی میں بھی جو ہندی میں بھی ہے۔ ہندی میں خفیف کسیرہ و ضمہ مدید تو ہیں، قصیر نہیں ہیں۔ ان کا کام بھی انہیں سے لیا جاتا ہے۔ فتح و مخفی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔

نکتہ - لفظ میں حرکات اور حروف مدہ کی جو جگہیں رکھی گئی ہیں ان سے دھوکا ہو سکتا ہے۔ اول الذکر حروف کے ساتھ ترکیب نہیں پاسکتی تھیں، ان کو ان کے اوپر نیچے رکھ دیا، اور حروف مدہ جو حرکات قصیر پر اضافہ اور ترتیباً ان کے بعد ہیں، حروف الصوت کے ساتھ ترکیب پاسکتے تھے، لہذا ان کو ان کے ساتھ منسلک کر دیا۔ حق ان کا یہی تھا کہ حرکات کے ساتھ اور منفصل رہے، لیکن اس صورت میں کتابت کی سہولت کم تھی۔ فاصلہ دونوں میں اب بھی زیادہ نہیں، صرف ارتفاع کا فرق ہے۔ چند الفاظ کو ترتیب ذہنی کے بموجب لکھیں تو وہ یوں ہوں گے:

کو = ت = کے = کیے = حرکات = حرکت = قصیر = قصیر = قابل = قبل = اضافہ = اضافہ = کاٹا = کٹا۔
ان مثالوں سے رُخ، استعین، لہذا وغیرہ کی کتابت کا مقابلہ کیجئے۔

الفاظ کو دو حرفی سے حرفی وغیرہ کتابت کے اعتبار سے، بشمول حروف مدہ جو جزو حرکت ہیں، کہا جاتا ہے۔ ان میں تعداد اصوات معلوم کرنی ہو تو حروف مدہ کو چھوڑ کر گنا جائے گا۔

یائے مخلوط - یہ بھی سب کا جزو ایمان ہے۔ خلاف قول مقالہ نگار کے اس کا رسم الخط بھی اپنی اپنی پسند کے مطابق نسبتاً مقرر کیا ہے۔ وہ مروجہ مختلف رسوم خط کو دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن یہ سب طریقے حقیقت الامر سے ناواقفیت کا نتیجہ ہیں۔ الفاظ کیا، کیوں، پیار میں خاص بات صرف یہ ہے کہ یا کا ماقبل ساکن ہے اور خود یا متحرک اور متحرک بھی بجز حرکت قصیر نہیں بلکہ بجز حرکت مدید کیونکہ اس کے بعد حرف مدہ ہے۔ صاحب مقالہ اور ان کے ہم خیال اصحاب کی اس قول میں ہمنوائی نہیں کی جاسکتی کہ ”ان میں اور ان کے مشابہ الفاظ میں واو اور یے کا تلفظ پورا نہیں، بلکہ ان کی آواز کمزور ہوتی ہے۔ یایوں کہئے کہ وہ آدھے پڑھے جاتے ہیں، حقیقت اس کے برعکس ہے جو تعریف ماقبل یا کی تھی وہ انہوں نے یا پر صرف کر دی۔ آدھا پڑھا جانے کی اصطلاح ہندی کی ہے اور اس کے معنی ہوتے ہیں حرف کا ساکن ہونا کیونکہ ساکن کی آواز بھی کھل کر نہیں پڑھی جاتی، کھل کر پڑھی جاتی ہے حرکت کے ساتھ۔ مثالیں ہندی الاصل ہیں

ہیں، اس دلیل کو کون سنتا ہے، آنکھ کے اشارے کو بھی کوئی نہیں مانتا، اس کو احوال بنا کر گویا یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ ۶ کاں کے را دو بھی ہمیشہ غلط

اب عقیدہ اٹل ہو گیا۔ مگر نہیں، وہاں اور مواد بھی ہے۔ بعض بعض ”قواعدوں“ میں صراحت ملتی ہے کہ ان حروف میں دو آوازیں ہیں، پہلی ہمیشہ ساکن۔ اور نہ ہو صراحت، اگر ایک آواز ہے تو بحالت تشدید اسی حرف کی تکرار ہونی چاہئے، پتھر یوں لکھا ہوا ملنا چاہئے $\overline{\text{پھر}}$ ، لیکن وہ ہے $\overline{\text{پھر}}$ ، پہلی آواز کی تکرار ہے، $\overline{\text{پھر}}$ الگ رہ گئی ہے۔ اردو میں اس کا ترجمہ پہلی صورت کی طرح پتھر + تھرنہ ہوا بلکہ پتہ + تھرنہ ہوا۔ اردو میں عقیدہ عام کی بنا پر صورت اول سے مفر نہیں۔ لہذا اردو کے پتھر میں بمقابلہ اصل کے ایک تھ زائد ہوئی۔ لہذا عقیدہ باطل ہوا۔

بھ ۴ کی مفرد آواز ہے تو ابھی، جھبی، کبھی وغیرہ میں جواب، جب، کب اور تہی سے مرکب ہیں اس کو کیوں لاتے ہیں؟ تینوں میں ت ساکن ہے اور تھ مکسور۔ مرکب ہونے سے ان کے سکون و حرکت میں کوئی فرق آ جاتا ہے؟ کچھ نہیں۔ دونوں ہر چار تہ ہیں صرف ادائی سکون کا زمانہ گھٹ جاتا ہے۔ ت کو چھو انہیں کہہ پر پہنچے نہیں۔

رومن میں بھی دو حرف، اور وہ بھی اردو حروف کے نظائر لکھے جانے کو شاید دونوں خطوں کی سازش سمجھا جاتا ہو۔ چشم عبرت میں تو یہ دیکھتی ہے کہ یہ بھی دو آوازوں کی کھلی دلیل ہے اور چونکہ دونوں حرفوں کے درمیان کوئی حرف حرکت نہیں ہے، لہذا اس خط کے اصول کے بموجب پہلا ساکن ہے۔ کیا یہ براہین قاطعہ اور ان معموں کی گرہ کشائی کے لئے کافی نہیں ہیں؟

ہندی میں تو ایسے حروف دس ہی ہیں، اردو میں ڈیوڑھے کیسے ہو گئے؟۔ تمھارا کام بھی مرکب ہے، نتھکا کا تھ بھی، چوٹھا کلھاڑی، ڈلھن کا لھ بھی۔ ہندی میں دو دو حرف $\overline{\text{پھر}}$ ، $\overline{\text{پھر}}$ ، $\overline{\text{پھر}}$ ہیں جن میں پہلا، آدھا، لہذا ساکن ہے۔ انھیں پر باقی دس کو کیوں قیاس نہیں کرتے، غرض ہندی میں ان حرفوں کی حیثیت سی ایچ (C) وغیرہ کی نہیں، ایکس (X) کی ہے جو دو سوتی ہے۔ ہندی میں ان ثنائیات بانی کے متعلق یک آوازی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا گیا۔ بلکہ ان کے دو آوازی ہونے اور صوت اول کے ساکن ہونے کی صراحت ہے۔ اسی واسطے اب یہ حروف فضول ہونے کی وجہ سے حروف تہجی سے نکالے جا رہے ہیں اردو دانوں کو اس فرسودہ مغالطے پر متنبہ ہونا چاہئے۔ لفظ میں جیسے اور کوئی دو حرف ساکن و متحرک آگے پیچھے آسکتے ہیں ویسے ہی یہ بھی ہیں۔ ہائے دو چشمی کا الزام لزوم والا لازم ہے۔ اہتمام اس اشارے کا کرنا چاہئے کہ ماقبل یا کو اطمینان سے نہیں سرعت سے پڑھنا ہوگا۔ میں نے اس کے لئے یہ ترکیب نکالی ہے کہ درمیان میں نون غنہ کے جزم کی طرح اس کا جزم اٹھا کر دیتا ہوں۔ ان حروف والے الفاظ کی صحیح تشکیل اب یوں ہوگی: ٹھٹھا۔ گھڑ۔ ٹھٹھل۔ لٹھٹھا۔ پٹھٹھا۔ پٹھٹھلی۔ پٹھٹھو۔ ان میں دو لفظ لکھنا، پٹھٹھا ایسے ہیں جن میں اٹھا جزم بنانے کی ضرورت ہے۔ (نکتہ) مشد حروف کو دیکھئے، دونوں دفعہ ساکن ہیں۔ پٹھٹھو = پٹھٹھو بروزن پشت رو۔ مشد کی مسلمہ تعریف بدل گئی۔

محمد شریف خاں شروانی۔ ام۔ اے

(باقی)

فاضل مقالہ نگار نے اردو رسم خط پر بہت فاضلانہ طریقہ سے اظہار خیال کیا ہے۔ کاش انداز بیان زیادہ سمجھا ہوا ہوتا۔ (اڈیٹر)

بوڑھیاں اتنی ہی ناواض — اُدھر ڈرامہ کا ڈراپ سین گرا اور اُدھر میری آنکھ کھل گئی۔“

میں نے اُس کے ہاتھ سے پینسل لے لی اور اُس کے لکھے ہوئے انجام کے آخری جملہ کو اس طرح بدل دیا:

”ڈرامہ کا ڈراپ سین پوری طرح گرنے بھی نہ پایا تھا کہ صاحبزادہ نے جو ہمارے بیچ میں سو رہے تھے اپنی چیخ سے ہم دونوں کو

جگا دیا۔“

اس ترمیم کو پڑھ کر اُس نے شرم سے نگاہیں نیچی کر لیں مگر ساتھ ہی میری پینسل بھی توڑ دی۔

ظفر الحسن (عثمانیہ)

ہٹلر اور سات کاہندسہ

یورپ میں سات کاہندسہ بہت مبارک مانا جاتا ہے لیکن ہٹلر سے زیادہ اس کا ماتنہ والا کوئی نہیں۔

اس نے سوا سٹکا کا نشان (SS) اسی لئے اختیار کیا ہے کہ اس میں سات کے چار اُلٹے ہندسے ایک دوسرے سے ملتے ہیں، گو قیصر ولیم اس نشان کو صرف اس لئے محبوب سمجھتا تھا کہ بودھ نے اسے وضع کیا تھا۔ لیکن اس عدد کا تعلق ہٹلر کی زندگی سے کتنا ہے اس کا حال ذیل کے واقعات سے معلوم ہوگا۔

(۱) پچھلی لڑائی میں جب اس کے سپاہیوں کا دستہ بالکل ختم ہو گیا اور وہ موت کے پنجے سے نکل بھاگا تو یہ اکتوبر ۱۹۱۸ء کی سات تاریخ تھی۔

(۲) سیاسیات میں حصہ لینے کے سات ہی سال بعد اس نے کتاب ”مین کا مہف“ لکھی۔

(۳) اس کی عمر ۴۲ (۶ x ۷) سال کی تھی جب نازیوں کی ریشٹاگ میں اکثریت ہوئی۔

(۴) اس نے زیکو سلوویکیا پر قبضہ کیا جب اس کی عمر ۴۹ (۷ x ۷) سال کی تھی۔

(۵) اس نے ۱۹۳۹ء میں یہ لڑائی شروع کی جو اس کے عروج کا ساتواں سال تھا۔

(۶) اس نے ۲۸ (۷ x ۴) دن میں پولینڈ کو فتح کیا۔

(۷) شاہ بلجیم نے مئی کی ۲۸ (۷ x ۴) کو اس کے سامنے ہتھیار ڈالے۔

(۸) فرانس سے صلح کی بات چیت جون کی ۲۱ (۷ x ۳) تاریخ کو ہوئی۔

(۹) سنگھ کا ساتواں مہینہ (جولائی) تھا جب اس نے محسوس کیا کہ وہ انگلستان پر حملہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

(۱۰) جون کی اکیس (۷ x ۳) تاریخ کو اس نے روس کی سرحد کی طرف اپنی فوجیں روانہ کیں۔

ہندوستانی صحافت کیپنی کے عہد حکومت میں

(بہ سلسلہ ماہ جولائی ۱۹۳۷ء)

ہندوستانی صحافت بہ اعتبار عمر، یورپ کی صحافت سے ڈیڑھ سو سال کم ہے۔ لیکن ہندوستان کی دیسی زبان کا پہلا اخبار کی دیسی زبان کی صحافت ہندوستان کی انگریزی صحافت سے صرف بیس سال پیچھے ہے۔ برطانوی اقتدار کے ساتھ ساتھ مغرب سے انقلاب کی جو تند و تیز موہائیں ہندوستان آئیں وہ اپنے ساتھ کچھ مفید پھلوں کے بیج بھی لیکر آئیں۔ ان میں ایک چیز جدید صحافت کی منظم اور ترقی یافتہ شکل بھی تھی، دراصل یہ وہ تبدیلیاں اور وہ ایجادیں تھیں جو مشرق و مغرب میں مشترک ہیں۔

دیسی زبان کا پہلا اخبار کس زبان کا تھا اور کب اُس کا اجراء ہوا؟ اس کا کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ مارگریٹا بارنس کا بیان ہے کہ اٹھارویں صدی کے آخر میں کچھ فارسی اخبارات کلکتہ میں موجود تھے، مگر ان کی کوئی کاپی دستیاب نہیں ہوئی۔ ممکن ہے کہ یہ بیان صحیح ہو، لیکن اس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ قلمی اخبارات تھے یا مطبوعہ مگر یہ اخبارات غیر مطبوعہ ہی ہو سکتے تھے کیونکہ فارسی رسم الخط کا پہلا مطبع کلکتہ میں ۱۸۱۰ء میں قائم ہوا۔ اس کا نام ہندوستانی پریس تھا اور اس کے مالک مولوی اکرام الدین صاحب تھے، جنہوں نے 'ہندوستانی' نام کا ایک اخبار بھی جاری کیا تھا۔ قاضی عبدالغفار صاحب نے بھی اپنی ریڈیائی تقریر میں اس پریس کا ذکر کیا تھا لیکن مالک مطبع کا نام اکرام علی تھا اور اس اخبار کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ بہر حال اس اخبار کے متعلق مزید معلومات یا تائید حاصل نہیں ہو سکی۔

انڈین ڈیلی میل کے مقالہ نگار کا بیان اگر غلط ہے تو دیسی زبان کے پہلے اخبار کا اجراء ۱۸۱۵ء میں ہوا۔ یہ بنگالی زبان کا ماہنامہ تھا اور اس کا نام ڈگ درشن (*Dig Darsan*) تھا۔ سیرام پور کی مشنری آبادی اس کی روح رواں تھی۔ اس اخبار میں چونکہ سیاسی مضامین بالکل نہ ہوتے تھے اس لئے حکومت نے بھی اُس کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا۔

دیسی زبان میں اخبار نکالنے کا خیال سب سے پہلے اس نوآبادی کے ایک ممتاز فرد ڈاکٹر مارش مین (*Marsh men*) کے دماغ میں آیا۔ لیکن اُن کے بعض رفقاء نے اس خیال کی مخالفت اس بنیاد پر کی کہ حکومت جو انگریزی اخبارات پر کڑی پابندیاں عاید کر رہی ہے وہ دیسی زبان میں اخبار کے اجراء کو پسندیدہ نظروں سے نہ دیکھے گی۔ بالآخر یہ طے پایا کہ پہلے ایک ماہنامہ "حکومت کی نباضی کرنے کے لئے" جاری کیا جائے۔ اگر اس سلسلہ میں حکومت نے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا تو یہ خیال ترک کر دیا جائے گا۔ لیکن خلاف امید حکومت نے اس رسالہ کے اجراء کو نا پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا۔ چنانچہ اب ایک ہفتہ وار اخبار سماچار درپن، کا اجراء

ہوا۔ ہندوستان میں یہ لارڈ ہیسٹنگز کا عہد حکومت تھا۔ انھوں نے اس پرچہ کو سجدہ پسند کیا اور اپنے ایک پرائیوٹ خط میں اس اقدام کی تعریف کی اور ڈاکٹر مارش مین کی استدعا پر ازراہ عنایت ایک چوتھائی محصول ڈاک بھی معاف کر دیا۔ ڈاکٹر ڈبلو، آپج، کیری (Carrey) (ک.ک.ک.) لکھتے ہیں کہ:

”پہلا بنگالی اخبار جو قرون کی گراں خوابی کے بعد نمودار ہوا اور جس نے باشندگان ملک کو خود غرضی کی بے حسی سے بیدار کیا وہ سیرام پور کا درپن تھا۔ اس اخبار نے اپنی زندگی ۲۳ مئی ۱۸۱۸ء کو شروع کی۔ مارکویس آف ہیسٹنگز آزاد صحافت کے دشمنوں کے پھانسنے ہوئے خیالی ہوسے سے متاثر نہیں ہوئے اور انھوں نے باشندگان ملک کو سیاسی تعلیم سے باخبر رکھنے کی پالیسی کو جو سابقہ حکومت کی پالیسی تھی جاری رکھنا مناسب سمجھا۔ چنانچہ موصوف نے درپن کو ہر ممکن امداد دی۔“

درپن، دیسی زبان کا تو پہلا اخبار یقیناً تھا، لیکن اس اخبار کو ہم ہندوستانی صحافت کا سنگ بنیاد نہیں قرار دے سکتے۔ کیونکہ اس کی ادارت وغیرہ سے ہندوستانیوں کو کوئی تعلق نہ تھا بلکہ اس کی پالیسی تمام تر سیرام پور کے غیر ملکی عیسائیوں کے ہاتھ میں تھی، جو ہر وقت حکومت اور راجہ باب حکومت کی نظروں کو دیکھا کرتے تھے۔ یہ عیسائی بیک وقت تاجر بھی تھے اور مبلغ بھی اور ان دونوں حیثیتوں سے ہندوستان میں اُن کا قیام کمپنی بہادر ہی کے رحم و کرم پر منحصر تھا، اس لئے ہم کو اُن سے توقع بھی نہیں ہو سکتی کہ وہ ہندوستانیوں کے جذبات اور خیالات کی ترجمانی کر سکتے تھے۔

ہندوستانی صحافت کے سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل ذکر اور محترم نام راجہ رام موہن رائے کا ہے جن کو بجا طور پر اس قافلہ کا کارواں سالار کہا جانا چاہئے۔ موصوف اپنے زمانہ کے سب سے بڑے قوم پرور ہندوستانی تھے۔ اُن کی انگریزی قابلیت اور انشا پر دازی کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ انگریزی کے علاوہ اُن کو فارسی اور سنسکرت پر بھی کئی عبور حاصل تھا اور ان زبانوں کے عالم سمجھے جاتے تھے۔

راجہ رام موہن رائے نے دسمبر ۱۸۲۱ء میں ایک ہفتہ وار بنگالی اخبار ”سمبد کمودی“ جاری کیا۔ لیکن اس اخبار کا اجازت نامہ حاصل کرنے کے لئے جو درخواست دی گئی تھی اُس میں راجہ صاحب کا نام نہ تھا بلکہ وہ درخواست بھوانی چرن بزرگی کے نام سے تھی۔ بہر حال یہ اخبار تھا راجہ ہی صاحب کا۔ یہ خالص سیاسی اخبار نہ تھا بلکہ سیاست سے زیادہ ہندو سماج کی اصلاح پر زور دیا جاتا تھا ان دنوں بنگال میں سستی کا رواج عام تھا۔ انھوں نے اس کے خلاف اپنا زور قلم صرف کر دیا۔ اس چیز نے ہندو قدامت پرست جماعت میں ہلچل مچا دی۔ اب اُن لوگوں نے بھی اپنا ایک اخبار ”سماچار چندریکا“ نکالنا شروع کیا، جس میں راجہ صاحب اور اُن کے ہم مشربوں کے مضامین کا جواب دیا جاتا۔ اس سلسلہ میں کامیابی راجہ صاحب ہی کو ہوئی اور حکومت نے قانوناً سستی کی رسم کو ممنوع قرار دیا۔ اس نزاع سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ دیسی زبان کے بہت سے اور اخبارات نکلنے لگے۔

راجہ صاحب نے ۱۸۲۲ء میں ایک فارسی ہفتہ وار ”مکانا شروع کیا اس کا نام ”مرآۃ الاخبار“ تھا۔ آزاد خیال اور ترقی پسند ہندوستانی جو مغربی تعلیم سے بھی کافی متاثر تھے، اُن لوگوں میں یہ اخبار سجدہ مقبول ہوا۔ ۱۸۲۳ء میں دیسی زبان کے اخباروں کی تعداد اور زیادہ بڑھی۔ سرکاری کاغذات سے بہتہ چلتا ہے کہ حسب ذیل اخبارات کے اجراء کے لئے درخواستیں دی گئیں:-

- (۱) سماچار چندریکا۔ بنگالی ہفتہ وار۔ اس کے اجراء کی اجازت کے لئے بھوانی چرن بنرجی نے ۱۱ اپریل ۱۸۲۳ء کو درخواست دی۔
- (۲) سمبد گامودی۔ بنگالی ہفتہ وار۔ یہ راجہ رام موہن رائے کا اخبار تھا اور اس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔
- (۳) جام جہاں نما۔ فارسی اور اردو ہفتہ وار۔ اس کے اجازت نامہ کے لئے ہری ہر دت نے ۹ اپریل ۱۸۲۳ء کو درخواست دی۔ اس کے ایڈیٹر لالہ سدا سکھ منشی تھے۔
- (۴) شمس الاخبار۔ فارسی و اردو ہفتہ وار۔ اس کے اجراء کی درخواست ماتھو موہن متر نے ۶ مئی ۱۸۲۳ء کو دی۔ اس کے ایڈیٹر منی رام ٹٹا کر تھے۔

۱۸۲۳ء میں ممبئی سے پہلے گجراتی اخبار کا اجراء ہوا۔ اس اخبار کا نام ممبئی سماچار تھا، جو سماچار پریس سے شائع ہوتا تھا۔ اس پریس کو فریدوں جی مرزا نے ۱۸۱۲ء میں قائم کیا تھا، جہاں سے پارسی مذہب کی کتابوں کے تراجم گجراتی زبان میں شائع ہوتے تھے۔ یہ اخبار ابھی تک جاری ہے اور اس کو دیسی زبان کا قدیم ترین اخبار کہنا چاہئے۔

”ہندی زبان اور دیوناگری رسم الخط“ کا پہلا اخبار اوتند مارتند تھا، جس کے اجراء کے لئے جنگل کشور شکلا نے ۹ فروری ۱۸۲۶ء کو درخواست دی۔ اس کے ایڈیٹر منو ٹٹا کر تھے۔ اس درخواست کے ساتھ ہی یہ بھی درخواست دی گئی تھی کہ اس اخبار کے پہلے نمبر کے لئے محصول ڈاک معاف کر دیا گیا۔

یہ اخبار شاید مقبول نہیں ہوا، کیونکہ اس کے اجراء کو پورا ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ جنگل کشور شکلا نے حکومت سے امداد حاصل کرنے کے لئے ایک طویل درخواست روانہ کی۔ اس درخواست میں اخبار کی مالی حالت کا رونا رویا لکھا تھا، مگر حکومت نے صاف جواب دیدیا۔

جان مارش مین (John Marsh man) ایڈیٹر دہلی نے ۸ فروری ۱۸۲۶ء کو حکومت کے چیف سکرٹری کی خدمت میں ایک درخواست پیش کی جس میں بتلایا گیا تھا کہ جب سے اخبار کا اجراء ہوا ہے، وہ پابندی کے ساتھ ہفتہ وار نکل رہا ہے۔ لیکن بنگال کی تمدنی سستی کی وجہ سے ایک ہزار روپیہ کا نقصان ہو رہا ہے۔

اس درخواست میں یہ استدعا کی گئی تھی کہ ڈیڑھ سو سرکاری افسروں کو (جن کی فہرست درخواست کے ساتھ منسلک تھی) اخبار بلا محصول ڈاک روانہ کرنے کی اجازت عطا کی جائے۔ حکومت نے یہ استدعا قبول کر لی اور اس کی باضابطہ اطلاع مارش مین اور پوسٹ ماسٹر جنرل کو دیدی۔

سیرام پور کی مشنری نوآبادی نے اسی زمانہ میں حکومت کے سامنے ایک فارسی اخبار کے اجراء کی تجویز بھی پیش کی۔ یہ درخواست حکومت کے چیف سکرٹری نے شعبہ فارسی کے سکرٹری مسٹر اسٹرننگ (Mr. Stirling) کے حوالہ کر دی۔ مسٹر اسٹرننگ نے مارش مین کو لکھا کہ حکومت ۱۶۰ اخبار ماہانہ خریدے گی جس کی قیمت ۱۶۰ روپیہ ماہانہ ہوگی۔ نیز اس جواب کے ساتھ ان لوگوں کی ایک فہرست منسلک کر دی جن کو اخبار روانہ کیا جانا منظور کیا گیا تھا۔ اس اخبار کا نام ”اخبار سیرام پور“ تھا۔

۱۳ اکتوبر ۱۸۲۶ء کو جام جہاں نما کے ایڈیٹر ہری ہر دت بنگ نے بھی ایک درخواست شعبہ فارسی کے چیف سکرٹری کی خدمت میں پیش کی۔ اس میں استدعا کی گئی تھی کہ جو مراعات اخبار سیرام پور اور دہلی کو حاصل ہیں وہی مراعات ’جام جہاں نما‘ کو بھی عطا کئے جائیں۔ حکومت نے اس کے جواب میں محصول ڈاک میں تخفیف کر دی۔ لیکن ۱۸۲۸ء میں مالی دشواریوں کی بنا پر یہ مصلحتاً حکومت

نے اخبار سیرام پور اور جام جہاں نامادونوں سے مراعات واپس لے لیں۔ سیرام پور والوں نے چیف سکریٹری وغیرہ کو متعدد درخواستیں دیں مگر سب کے جواب میں حکومت نے اپنی معذوری کا اظہار کیا۔

لارڈ میننگ کا عہد حکومت ہندوستان میں برطانوی حکومت کی تاریخ کا اہم ترین دور ہے۔ اس زمانہ کی علمی اور صحافتی ترقیاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لارڈ موصوف کو ان چیزوں سے شاید دلچسپی بھی تھی۔ ہندوستانی صحافت کے ابتدائی دور کی حالت کا اندازہ ہم کو اُس خط سے ہو سکتا ہے جو مسٹر اسٹرلنگ نے لارڈ میننگ کے استفسار کے جواب میں لکھا تھا۔ اقتباسات ملاحظہ ہوں:

”لارڈ میننگ نے اپنے خط میں جو استفسار فرمایا ہے، اُس کے جواب میں اختصار کے ساتھ میں دیسی پریس کی حالت بیان کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔

”۱۸۲۷ء سے ۱۸۲۶ء تک دیسی زبان میں کلکتہ سے چھ اخبارات شائع ہوتے تھے۔ تین بنگالی زبان میں، دو فارسی میں اور ایک ہندی میں۔ ان کے علاوہ سیرام پور کی مشنری بھی دو اخبار ایک بنگالی زبان میں اور دوسرا فارسی میں نکالتے تھے۔ اول الذکر اخبارات میں سے دو اخبار یعنی ایک فارسی اور ایک ہندی ۱۸۲۶ء میں فقدان حمایت کی وجہ سے بند ہو گئے۔ حکومت نے چونکہ تحقیق کے باعث اپنا چندہ بند کر دیا ہے اس لئے سیرام پور کی مشنری بھی اپنا اخبار گزشتہ جون سے بند کرنے پر مجبور ہو گئے۔ رہا سہا فارسی اخبار جام جہاں نام تھا، اُس کا چندہ بھی حکومت نے بند کر دیا ہے۔ جہاں تک ٹائپ اور کاغذ کا تعلق ہے اب اُس کی حالت پہلے سے گرجی ہے اور اب اُس کی زندگی کا تمام تر انحصار اُن چند انگریزوں کی سرپرستی پر ہے، جن میں ایک میں بھی ہوں، جو ان اخباروں کی اشاعت کو اہمیت دیتے ہیں اور جن کا یہ خیال ہے کہ اخبارات کے ذریعہ ہندوستانیوں میں علم پھیلایا جاسکتا ہے۔

ہندوستانی سماج کے موجودہ دور میں یہ خیال کرنا یقیناً حق بجانب ہے کہ دیسی اخبارات ایک نوع کی عیاشی ہیں اور جن کی کلکتہ کے باہر کوئی مانگ نہیں ہے۔ چنانچہ اگر حکومت اور اُس کے افسران اخبارات کی حمایت سے دستکش ہو جائیں اور اخبارات کو خود اڈیٹروں کے وسائل پر چھوڑ دیا جائے تو اندرون ملک میں اُن کو ایک بھی گاہک نہ ملے گا یا زیادہ سے زیادہ ایک دو پرچے نکل جائیں گے۔

بنگالی زبان کے پرچے ہمیشہ ترقی پذیر رہے ہیں۔ کلکتہ کی ہندو آبادی کا وہ بڑا طبقہ جو انگریزی مذاق اور انگریزی خیالات میں غرق ہو چکا ہے اُن کی حمایت کرتا ہے اور دوسرے لوگوں میں بھی خبروں سے واقف ہونے کا ذوق پیدا ہو گیا ہے۔ ان اخبارات میں جہاز رانی کی ٹیس بلند بھاؤ، تقرر کی خبریں، پولیس کی خبریں، عدالت عالیہ کے فیصلوں کے اقتباسات اور سٹی کی خبریں ہوتی ہیں۔ یہ اخبارات بعض یورپین اڈیٹروں کی تنقید کے جواب میں اکثر سٹی کی رسم کی حمایت کرنے کے علاوہ شاذ و نادر ہی داخلی یا خارجی سیاسی معاملات کو ہاتھ لگاتے ہیں یا اُن کے متعلق رائے ظاہر کرتے یا پیشین گوئی کرتے ہیں۔

”..... جام جہاں نام جو میرے خیال میں اُن تمام دیسی اخبارات میں اول درجہ کا مالک ہے جو اب تک جاری ہوئے ہیں۔

اُس میں کبھی بھی کوئی طبع زاد چیز نہیں ہوتی۔ کلکتہ کے بہترین انگریزی اخبارات کے جیدہ حیدہ مضامین کا ترجمہ ہوتا ہے یا پھر اُس میں ہندوستانی درباروں کی خبریں ہوتی ہیں..... اس اخبار کی نمایاں خصوصیت اُس کے اڈیٹر کا حسن انتخاب ہے جو انگریزی مضامین کے انتخاب سے ظاہر ہوتا ہے اور دوسری خصوصیت اُس کے ترجمہ کی خوبی ہے..... جام جہاں نام کے صفحات میں شاید ہی کبھی کوئی ایسی بات لکھی گئی ہو جس سے حکومت کے کسی اقدام پر مکتہ چینی یا بیزاری کا اظہار ہوتا ہو۔

باوجود اُس امداد کے جو اس اخبار کو حاصل ہے، ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ اخبار بیٹھ رہا ہے اور مجھ کو ڈر ہے کہ یہ زیادہ عرصہ تک

اپنے عہدہ سے استعفا دیدیا اور اُن کی جگہ سرچارلس مٹکاف (Sir Charles Metcalf) نے لی، جو کونسل کے سینئر ممبر تھے۔ لارڈ بنٹلک نے اخبارات کے قوانین کی اصلاح کا خیال ظاہر کیا تھا اور اس کے لئے وہ زمین بھی طیار کر رہے تھے، لیکن یہ کام شروع کرنے سے پہلے ہی اُن کو مستعفی ہو جانا پڑا۔ سرچارلس مٹکاف نے بھی اپنے پیشرو کی پالیسی کو جاری رکھنا ہی مناسب سمجھا۔ چنانچہ انھوں نے مکالے (Macaulay) کو اخبارات کے لئے نئے قانون کا مسودہ طیار کرنے کی ہدایت کی۔ میکالے اُس وقت سپریم کونسل کے قانونی ممبر تھے۔

میکالے نے جو مسودہ مرتب کیا تھا اُس نے ۳ اگست ۱۸۳۵ء کو قانونی شکل اختیار کر لی۔ اس قانون کا بنیادی خیال یہ تھا کہ ملک کے تمام طبقوں کو اظہار خیال کی آزادی حاصل ہونی چاہئے۔ جو لوگ اس قانون کی مخالفت کر رہے تھے اُن کو مخاطب کرتے ہوئے انھوں نے کہا:-

”اگر اُن کا استدلال یہ ہے کہ علم کی ترقی ہندوستان میں جاری حکومت کے لئے مفرت رساں ثابت ہوگی تو میں اُن کے استدلال کو تسلیم کرتے ہوئے یہ کہوں گا کہ اس کے نتائج جو بھی ہوں لیکن یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم ہندوستان کو علم سے بہرہ اندوز کریں۔ اگر ہندوستان کو سلطنت برطانیہ کا ایک حصہ بنائے رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہاں کے باشندوں کو جاہل رکھا جائے تو ہماری حکومت اُس ملک کے لئے باعث لعنت ثابت ہوگی اور اُس کو ختم ہونا چاہئے۔ لیکن مجھ کو توجہات میں خطرہ کے امکانات زیادہ نظر آتے ہیں..... بہر حال ہندوستان کے مستقبل کی حکومت کے متعلق خدا کی جو بھی مرضی ہو، ہمارا یہ کھلا ہوا فرض ہے کہ جب تک یہاں کی

عنان حکومت ہمارے ہاتھوں میں رہے ہم باشندگان ملک کی بھلائی و بہبودی کا فرض بہتر سے بہتر انداز میں ادا کریں۔“

کلکتہ کی آبادی نے سرچارلس مٹکاف کے اس اقدام کا استقبال مسرت اور تشکر کے ساتھ کیا اور کلکتہ میں دریائے ہنگلی کے کنارے اس واقعہ کی یادگار کے طور پر ایک لائبریری قائم کی، جس کی عمارت آج مٹکاف ہال کے نام سے مشہور ہے۔

۱۸۳۵ء میں وہگ پارٹی (Hogg Party) انگلستان میں برسرِ اقتدار آئی۔ اس حکومت کو مٹکاف کا یہ اقدام بیحد ناگوار تھا۔ اُس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ سر مٹکاف گورنر جنرل کے عہدہ سے معذور کر کے صوبہ شمالی و مغربی کا گورنر بنایا اور اُن کی جگہ پر لارڈ آکلینڈ کو گورنر جنرل کے عہدہ پر مامور کیا۔ ارباب حکومت کا خیال تھا کہ سر مٹکاف کا یہ اقدام ”عارضی تحسین حاصل کرنے کی غیر دانشمندانه خواہش“ کا نتیجہ تھا۔ ۱۸۳۶ء میں مٹکاف مدراس کی گورنری پر متعین کئے گئے لیکن گورنر جنرلی اُن کو کبھی بھی نہیں مل سکی۔ اس سلسلہ میں اُن کے ایک استفسار کے جواب میں کمپنی کے ایک ڈائریکٹر نے صاف صاف لکھا کہ ”پرس کی آزادی اُن کا ناقابل معافی جرم ہے“ ۱۸۳۸ء میں مٹکاف انگلستان واپس گئے۔

مٹکاف نے اخبارات کے باب میں جو پالیسی اختیار کر لی اُس کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ اخبارات کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ جو اخبارات پہلے سے موجود تھے وہ بھی برابر جاری رہے۔ اُن کے علاوہ جو نئے اخبارات جاری ہوئے اُن میں قابل ذکر یہ ہیں:

(۱) ماد عالم فروز - فارسی ہفتہ وار۔ اس کے ایڈیٹر اور مالک مولوی و باج الدین صاحب تھے۔ اور اس کے اجراء کی درخواست ۲۲ مارچ ۱۸۳۳ء کو دی گئی۔ اخبار کا دفتر ۵۳ تالکہ اسٹریٹ (کلکتہ) میں تھا۔

(۲) ہیرنیر - فارسی - ہفتہ میں دو بار - ہیرنیر پریس میں چھپتا تھا جو ۱۸۸۵ء چلنگا، مہدی باغ کلکتہ میں تھا۔ اس کے اجراء کی صحیح تاریخ کا علم نہیں اور یہ بھی معلوم ہو سکا کہ اس کے ایڈیٹر کون بزرگ تھے۔

(۳) سلطان الاخبار - ہفتہ وار فارسی - اس کا پہلا نمبر ۱۲ اگست ۱۸۳۵ء کو شائع ہوا۔

(۴) آئینہ سکندر - ہفتہ وار فارسی اخبار - "طبع آئینہ سکندر سے شائع ہوتا تھا جو چلنگا میں تھا۔ اس کے اجراء کی بھی صحیح تاریخ کا علم نہیں لارڈ آکلینڈ جو سر چارلس مٹکاف کے جانشین تھے وہ بھی صحافت کے باب میں مٹکاف کے ہم خیال تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اخبارات کے ایڈیٹروں سے حکومت کے تعلقات خوشگوار رہے اور اخبارات کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ لارڈ مونسون نے یہ بھی کوشش کی حکومت کے ملازمین جو قانوناً اخبارات سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھ سکتے تھے، ان کو اخبارات سے متعلق ہونے کا حق پھر ویدیا جیٹے۔ اسکی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ قانون امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ مردہ ہو چکا تھا اور سرکاری ملازمین برابر منشا میں اخبارات میں دیا کرتے تھے۔

اردو صحافت اردو صحافت کی بنیاد یوں تو ہندوستانی صحافت کی ابتداء ہی کے ساتھ پڑی، کیونکہ اکثر فارسی اخبارات کے ساتھ اردو میں بھی خبریں بطور ضمیمہ شامل ہوتی تھیں، لیکن اردو اخبار نویسی کی ابتداء ۱۸۳۵ء سے ہوتی ہے، اگرچہ اردو پریس (کلکتہ) ۱۸۱۸ء میں قائم ہو چکا تھا، جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ ۱۸۳۳ء میں دو اخباروں کا اجراء ہوا۔ خیر خواہ ہند (بنارس) اور سید الاخبار (دہلی)۔ خیر خواہ ہند کا پتہ قاضی عبدالغفار صاحب نے دیا ہے، آپ فرماتے ہیں کہ "اردو کا پہلا اخبار خیر خواہ ہند کے نام سے ۱۸۳۳ء میں بنارس سے جاری ہوا۔ یہ اخبار ٹائپ میں چھاپا جاتا تھا اور اس کے مالک پادری سر شریعہ صاحب تھے۔ یہ پہلا شائع تو بنارس سے ہوتا تھا مگر طبع ہوتا تھا کلکتہ کے پرنٹ مشن پریس میں"۔

"سید الاخبار کا ذکر کرتے ہوئے مارگریٹا بارنس نے لکھا ہے کہ "سر سید احمد خاں کے بھائی سید محمد خاں نے ۱۸۳۳ء میں دہلی سے سید الاخبار کا اجراء کیا، جو شاید اردو کا سب سے پہلا اخبار تھا۔ بدقسمتی سے ایڈیٹر کا جوانی ہی میں انتقال ہو گیا۔ اب اخبار کی ادارت سید احمد خاں نے سنبھالی، لیکن ان کی اور مشغولیتوں نے ان کو اخبار بند کرنے پر مجبور کیا"۔

ایک صاحب ایک تیسرے اخبار کا نشان بتلاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مولوی محمد حسین آزاد کے والد مولوی باقر حسین صاحب نے ۱۸۳۸ء میں دہلی سے اردو اخبار کے نام سے اردو کا پہلا اخبار جاری کیا۔ ان کے بیٹوں کے مطابق یہ ایک ادبی پرچہ تھا جس میں اساتذہ کی ہم وزن اور ہم قافیہ غزلیں چھپتیں اور ادبی مباحثے ہوتے۔

تعب ہے کہ قاضی عبدالغفار صاحب نے تو سید الاخبار کا کوئی ذکر کیا ہے اور نہ اردو اخبار کا۔ ایک اردو اخبار کا ذکر قاضی صاحب نے کیا ہے لیکن وہ یہ اخبار نہیں ہے بلکہ وہ "آخری تاجدار مغلیہ کے دربار کا روزنامہ تھا"۔

مارگریٹا بارنس نے لکھا ہے کہ "۱۸۳۸ء میں دہلی اخبار کا اجراء ہوا اور اس کے ساتھ ہی فوٹو ناظرین اور قرآن السعدین جاری ہوئے۔ موزن انڈیا کے ایڈیٹر ہندوستان تھے۔ دہلی اخبار سے مراد شاید اردو دہلی اخبار ہے لیکن اس اخبار کا اجراء ۱۸۳۸ء میں نہیں بلکہ (قاضی صاحب کے بیان کے مطابق) ۱۸۵۲ء میں ہوا۔ گارسن دی ماسی نے بھی ۱۸۵۲ء میں اس خبر کا

ذکر کیا ہے: "قرآن السعدین" اور فوائد الناظرین، کا ذکر قاضی صاحب نے نہیں کیا ہے اگرچہ کارسان دی تاسی کے خطبات میں ان کا ذکر موجود ہے۔ یہ اخبار اُس کے بیان کے مطابق ۱۸۵۲ء میں موجود تھے۔ "قرآن السعدین" کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ "باتصویر اخبار ہے جس میں سائنس، ادب اور سیاست سے بحث ہوتی ہے۔۔۔۔۔ اس کا مقصد اپنے ہوطنوں میں مغربی معلومات کی اشاعت ہے۔ اس میں خبریں بھی شائع ہوتی ہیں۔ ہفتہ میں ایک بار شائع ہوتا ہے۔" فوائد الناظرین، کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ "اس میں علاوہ اور خبروں کے مضامین بھی چھپتے ہیں جو انگریزی ذرائع سے ماخوذ ہوتے ہیں۔"

دہلی میں اردو کا پہلا مطبع غالباً ۱۸۴۵ء میں قائم ہوا۔ اس کے مالک مولوی عنایت حسین تھے اور اس کا نام دارالسلام تھا۔ اب مطبعوں کی تعداد میں اضافہ بڑی سرعت کے ساتھ ہو رہا تھا۔ چنانچہ کارسان دی تاسی کے بیان کے مطابق مالک مغربی و شمالی میں "جنوری ۱۸۵۱ء میں ۲۳ سگی مطبعے تھے، جن میں ہندوستانی کتابیں چھپتی تھیں۔ گزشتہ سال لاہور میں ایک اور مطبع قائم ہوا۔ گویا اس سال یکم جنوری کو مطبعوں کی تعداد ۲۴ ہو گئی۔ یعنی سات آگرہ میں، پانچ دہلی میں، دو لاہور میں، چار بنارس میں، ایک شملہ میں اور ایک اندور میں۔ لیکن ہندوستان کا یہی ایک حصہ ایسا نہیں ہے جہاں سے ہندوستانی کتابیں اور اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ اس قسم کے مطبعے تین احاطوں کے دارالسلطنتوں میں نیز بہت سے دوسرے شہروں میں پائے جاتے ہیں۔ صرف ایک لکھنؤ میں تیرہ ہیں جو کام کر رہے ہیں۔" مطبعوں کی یہ تعداد ۱۸۵۲ء میں ۲۳ سے بڑھ کر ۳۲ ہو گئی، جہاں سے ۱۳۲ اخبارات شائع ہوتے تھے۔۔۔۔۔ جنوری ۱۸۵۳ء میں چھاپے خانوں کی تعداد ۳۸ تک پہنچ گئی اور ہندوستانی اخبارات کی تعداد ۳۰ ہو گئی۔

ذیل میں ان اردو اخبارات کی فہرست پیش کی جاتی ہے جو ۱۸۵۰ء تک شائع ہوئے۔ یہ فہرست مارگریٹا بارس کی کتاب (The Indian Press) خطبات کارسان دی تاسی اور قاضی عبدالغفار صاحب کی ریڈیائی تقریر سے مرتب کی گئی ہے۔ "ہندوستانی" یہ اخبار ہندوستانی پرس کلکتہ سے شائع ہوا، جس کو ۱۸۱۱ء میں مولوی اکرام الدین صاحب نے قائم کیا تھا۔ 'جام جہاں نما' یہ مستقل اردو اخبار نہیں تھا بلکہ دراصل یہ فارسی اخبار تھا لیکن اُس میں کچھ خبریں اور مضامین وغیرہ اردو میں بھی ہوتے تھے۔ اس کے ایڈیٹر لالہ سدا سکھ نشی تھے اور اس کا اجراء اپریل ۱۸۲۳ء میں ہوا تھا، خیر خواہ ہند، ۱۸۳۳ء میں بنارس سے جاری ہوا۔ ایڈیٹر پادری شرسن تھے۔ اسی سنہ میں سید الاخبار سید محمد خاں نے جاری کیا۔ اس کے بعد ہی شاید اردو اخبار بھی دہلی سے جاری ہوا۔ بولانی، مذہبی رسالہ تھا۔ حسن علی محشر ایڈیٹر تھے۔ لکھنؤ سے ۱۸۴۲ء میں جاری ہوا۔ اسی سال کلکتہ سے 'جام جہاں نما' اور 'مخزن الادویہ' جاری ہوئے۔

۱۸۴۵ء میں کلکتہ سے 'لیسی' اور لکھنؤ سے احمدی جاری ہوئے۔ اول الذکر شاید عیسائیوں کا اخبار تھا۔

۱۸۴۶ء میں چار نئے اخبارات کا اجراء ہوا۔ کلکتہ سے 'احمدی'، لکھنؤ سے 'خیالی'، اور آگرہ سے 'صدر الاخبار' اور 'مدرسہ'۔

۱۸۴۷ء میں 'اسعد الاخبار' کا آگرہ سے اور 'مرآۃ الاخبار' کا کلکتہ سے اجراء ہوا۔

۱۸۴۹ء میں بنارس سے ایک گلدستہ اور ایک اخبار شائع ہونے لگے۔ گلدستہ کا نام 'گلزارِ ہمیشہ بہار' تھا اور اخبار کا نام 'مرآۃ العلوم' تھا۔ اسی سال اندور سے 'مدرسہ' اور مالوہ اخبار جاری ہوئے۔ موخر الذکر کی ایک یہ خصوصیت تھی کہ اس میں اردو اور

دونوں رسم الخط مشترک ہوتے تھے۔ مالوہ اخبار کے ایڈیٹر و حرم نرائن صاحب تھے۔

۱۸۵۰ء میں ممبئی سے 'صالحی' اور پنجاب سے 'کوہ نور' (لاہور) اور گلزار پنجاب (گجراتوالہ) کا اجراء ہوا۔ اول الذکر کے

ایڈیٹر ہر سکھ رائے صاحب تھے۔

۱۸۵۱ء میں دہلی سے 'دہلی اردو اخبار' کا اجراء ہوا، اور لدھیانہ سے محمد حسین نے 'نور علی نور' نکالنا شروع کیا۔

۱۸۵۲ء میں چشمہ فیض، کالاہور سے اجراء ہوا۔ گارساں دی تاسی کے بیان کے مطابق: اخبار سیالکوٹ سے نکلتا تھا۔ اسی

سال 'خورشید عالم' کا بھی سیالکوٹ ہی سے اجراء ہوا۔ ان کے علاوہ الہ آباد سے 'نور الابصار' شاہ آباد سے 'نور الانوار' اور دہلی سے وحید اخبار جاری ہوئے۔ ۱۸۵۳ء میں پانچ نئے اخبارات کا اضافہ ہوا۔ یعنی آگرہ سے 'احمدی' اور زبدۃ الاخبار، فککنے لگے۔ لکھنؤ سے 'ذوالفقار حیدری'

بنارس سے 'مفاد ہندو' اور لاہور سے 'ہمائے بہا' کا اضافہ ہوا۔

۱۸۵۵ء میں دو قانونی پرچے نکلتے لگے: 'ویکی رپورٹ'، گیا سے اور 'معدن القوانين'، آگرہ سے۔

۱۸۵۶ء میں حسب ذیل اخبارات موجود تھے: 'مطلع الاخبار' (آگرہ)۔ 'اخبار الحقائق'، یہ ہفتہ میں دو بار شائع ہوتا تھا۔

'اسعد الاخبار' یہ ہفتہ وار تھا۔ 'قطب الاخبار' یہ مذہبی رسالہ تھا۔ 'معیار الشعراء' ادبی رسالہ تھا جس میں قدیم اور جدید شعراء کے کلام درج ہوتے تھے۔ 'اخبار النواح'، اس کے ایڈیٹر حکیم جواہر لال تھے۔ ابتداء میں یہ ادبی پرچہ رہا لیکن آگے چل کر خبریں بھی شائع ہونے لگیں۔ آگرہ گورنمنٹ گزٹ، سرکاری گزٹ تھا جو انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ 'سراج الاخبار' دہلی سے شائع ہوتا تھا اور بقول گارساں دی تاسی وہاں کلہاڑا نا پرچہ تھا۔ مظہر الحق: یہ بھی دہلی سے شائع ہوتا تھا اور اس کے ایڈیٹر محمد علی صاحب تھے۔

'رفیق الاخبار' یہ بھی شاید دہلی ہی سے شائع ہوتا تھا۔ 'مفتاح الاخبار' یہ میرٹھ سے شائع ہوتا تھا اور اس کے ایڈیٹر محبوب علی تھے جنھوں نے 'لفت اللغات' کا خلاصہ کیا تھا جو ۱۸۵۴ء میں لکھنؤ سے طبع ہوا۔ 'جام جہاں نما' یہ بھی میرٹھ ہی سے شائع ہوتا تھا۔ اس اخبار میں سرکاری گزٹ، اور مالک مغربی و شمالی کی عدالت عالیہ کے فیصلوں کے اقتباسات درج ہوتے تھے۔ اس کے ساتھ ایک ورق بطور ضمیمہ کے بھی شامل ہوتا تھا جس میں فیضی کی مہابھارت کا ترجمہ ہوتا تھا۔ بنارس سے ۶ اخبار شائع ہو رہے تھے۔ چار اردو کے، ایک فارسی کا اور ایک ہندی کا، موخر الذکر کا نام 'بنارس اخبار' تھا۔ دونوں کے ایڈیٹر ایک ہندو بزرگ تھے۔ یہ اخبار مذہبی مسائل پر بحث کرتے تھے۔ ان کے اجراء کا مقصد دراصل عیسائیوں کے پروپگنڈے کا جواب دینا تھا۔ سدھاکر اخبار ابتداء میں ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا مگر آگے چل کر صرف ہندی اخبار ہو گیا۔ اس کی ہندی دقیق اور سنسکرت کے الفاظ سے بھری ہوتی تھی نثریاً۔

انگریزی حکومت کو اچھا سمجھتا تھا۔ 'باغ دہلی' اس اخبار کو مہاراجہ بنارس کی سرپرستی حاصل تھی۔ 'نارین ہند' یہ پندرہ روزہ تھا خبروں کے علاوہ مضامین بھی ہوتے تھے۔ 'بنارس ہرکارا' کا اجراء ۱۸۵۷ء میں ہوا تھا۔ عمدۃ الاخبار، بریلی سے لکشمی پرشاد صاحب

نکالتے تھے، جنھوں نے ایک علمی و اخلاقی انسائیکلو پیڈیا بھی مرتب کی تھی۔ شملہ سے شیخ عبداللہ کا 'شملہ اخبار' بھی نکل رہا تھا۔

راجہ صاحب بھرتپور کی سرپرستی میں بھرتپور سے 'مظہر السرد' شائع ہوتا تھا۔ اس کے ایک کالم میں ہندی اور دوسرے میں اردو ہوتی تھی۔ پنجاب میں لاہور سے 'دریائے نور' امرتسر سے 'باغ نور' اور ملتان سے 'ریاض نور' شائع ہوتے تھے۔

۱۸۵۳ء میں دہلی سے متعدد اخبارات شائع ہوتے تھے۔ ان میں قابل ذکر صادق الاخبار (فارسی)، 'نور مغربی' اور 'نور شرقی' ہیں۔ صادق الاخبار مصطفیٰ خاں کے مصطفیٰ پریس میں چھپتا تھا۔ پہلے یہ پریس لکھنؤ میں تھا لیکن بعض وجوہ کی بنا پر وہاں بند ہو گیا

پھر اُس کی ایک شاخ کانپور میں اور دوسری دہلی میں کھولی گئی۔ بقول خواجہ حسن نظامی صاحب ”بہادر شاہ ظفر کے مقدمہ کے سلسلہ میں اس اخبار (صادق الاخبار) کے اقتباسات سرکاری وکیل نے بطور شہادت استغاثہ پیش کئے تھے۔ دوران مقدمہ میں ایک ہندو اخبار نویس نے اس اخبار کو بہت گرم اور سنہ زور اخبار بیان کیا تھا اور کہا تھا کہ بادشاہ اور شہزادے اس اخبار کو بہت شوق سے پڑھتے تھے اور عوام میں بھی اس کو از حد مقبولیت حاصل تھی۔۔۔۔۔ اسباب غدر میں ایک سبب یہ اخبار اور اس کی پر جوش خبریں بھی سمجھی گئی تھیں۔ دہلی کے علاوہ ملتان سے ”شعاع شمس“ اور سیالکوٹ سے ”چشمہ فیض“ جاری تھے۔ اول لکڑی کے اڈیٹر غلام نصیر الدین صاحب تھے اور اُس کو مہاراجہ ملہر کی سرپرستی بھی حاصل تھی۔

۱۸۵۷ء میں آگرہ سے ”نور الاخبار“ اور ”بھٹی پرکاش“ نکل رہے تھے۔ ان دونوں اخباروں کے اڈیٹر ایک ہندو بزرگ سدا سکھ صاحب تھے، جن کو انگریزی میں کافی جہارت تھی اور کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ یہ دونوں اخبار اپنے مواد اور اپنے انداز بیان کی وجہ سے مقبول تھے۔ بنارس سے ”آفتاب ہند“ نکل رہا تھا، اس کے اڈیٹر بابو گوند رگھوناتھ تھے جو متعدد قابل قدر کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ یہ اخبار اپنے سائنٹفک اور تاریخی مضامین کے لئے مشہور تھا۔ ”فتح الاخبار“ علی گڑھ (کوئل) سے نکلتا تھا۔

ہندوستانی اخبار نویسی کا یہ دور جو ۱۸۵۷ء کے ساتھ ختم ہوتا ہے اُس کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ عام طور پر لوگوں نے اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ اردو کو بنایا۔ اور اس اعتبار سے اُس دور کی ہندوستانی صحافت میں ہم اردو کو اول درجہ کا مالک کہہ سکتے ہیں۔ اس میں ہندو مسلمانوں کی کوئی تخصیص نہ تھی بلکہ ایمان کی تو یہ ہے کہ ہندوؤں نے مسلمانوں سے بہت زیادہ اخبار نکالے یہاں تک کہ ان کے مذہبی اخبارات بھی اردو ہی میں نکلتے۔

اس دور کے اختتام سے پہلے ممبئی میں بھی ہندوستانی صحافت شروع ہو گئی تھی۔ لیکن وہاں سے بیشتر گجراتی زبان کے اخبارات شائع ہوتے تھے۔ اُن میں قابل ذکر دو تھے۔ ایک تو ”راست گفتار“ جو پندرہ روزہ تھا۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس کے اڈیٹر مشہور محب وطن دادا بھائی نور ورجی آنجنہانی تھے۔ اس اخبار کی مالی امداد خورشید جی کا ما کرتے تھے۔ دوسرا قابل ذکر اخبار ”اخبار سوداگر“ تھا۔ یہ سہ روزہ تھا۔ اس کے اڈیٹر دادا بھائی کاؤس جی تھے۔

۱۸۵۹ء میں لارڈ آکلینڈ نے جان کلارک مارش من کو بنگالی زبان کے اخبارات کے متعلق تحقیقات کرنے پر متعین کیا۔ اُن کے بیان کے مطابق بنگالی اخبارات کی حالت

زیادہ اچھی نہ تھی۔ سماچار چندریکا جس کا اجراء ۱۸۲۲ء میں ہوا تھا اُس کے خریداروں کی تعداد صرف ۲۰۰ سے لیکر ۲۵۰ تک تھی۔ سماچار دہن۔ اس کی حالت نسبتاً بہتر تھی اور اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ یہ اخبار سیرام پور کی مشنری آبادی کا آرگن تھا۔ اس کے خریداروں کی تعداد ۳۹۸ تھی۔ ”بنگادت“۔ یہ بنگال کا بہت اچھا اخبار تھا۔ اس کا اجراء ۱۰ اپریل ۱۸۳۷ء کو ہوا تھا اور اس کے روح رواں روپرٹ مائیکل مارٹن۔ دوارکانا تھ ٹیگور، پیرس ناتھ کمار ٹیگور اور راجہ رام موہن رائے تھے، لیکن اس کے خریداروں کی تعداد ۱۸۳۷ء میں صرف ۱۱۱۶ سے لیکر ۱۸۳۶ء تک حسب ذیل بنگالی زبان کے اخبارات کا اجراء ہوا یہ فہرست ریواڑیج۔ لانگ (Rev. J. Long) نے ۱۸۵۵ء میں حکومت کے ملاحظہ کے لئے پیش کی تھی۔

۱۔ ”غدر دہلی کے اخبار“ صفحہ ۱۔

۲۔ The Indian Press P. 230

۳۔ Early History & Growth of Calcutta P. 246.

نام اخبار	تاریخ اشاعت	مدت حیات	نام ایڈیٹر
(۱) بنگال گزٹ	۱۸۱۶ء	۱ سال	گنگا دھر بھٹا چارجی
(۲) سماچار درپن	۱۸۱۸	۲۱ "	جے۔ مارشلس مین
(۳) سنگباد کامودی	۱۸۱۹	۳۳ "	بابوتارا چند دت و بھبانی چرن بنرجی
(۴) سماچار چندریکا	۱۸۲۲	—	بھبانی چرن بنرجی
(۵) سنگباد ترنا سک	—	۱۰ "	کرستو موہن داس
(۶) بنگادت	—	۱۶ "	نیلرتن بلدر
(۷) سنگباد پردکار	۱۸۳۰	۲۵ "	ایشور چندر گپتا
(۸) سنگباد سدھا کر	—	۳ "	پریم چند رائے
(۹) انوبدی کا	—	۲ "	—
(۱۰) جنایشون	۱۸۳۱	۱۳ "	دھننرنجی مکرجی
(۱۱) سکھا کر	—	۱ "	پی۔ رائے
(۱۲) سنگباد رتنا کر	—	۱ "	برج موہن سنگھ
(۱۳) سماچار سواراجندرا	—	—	دلیپ چندر جیو پادھیال
(۱۴) شاستر پر دکاشش	—	۱ "	لکشمنی نرائن نیا پادھیال
(۱۵) وگین سبادھیس	—	—	گنگا چرن سین
(۱۶) گنان سندھو ترنگ	—	—	راسک کرستو ملک
(۱۷) گنادوئے	—	—	رام چندر ملک
(۱۸) پاشابلی	—	—	موہن چندر پال
(۱۹) سنگباد رتنا بلی	۱۸۳۲	—	مہیش چندر پال
(۲۰) سنگباد سرسن گڑھ	—	—	بینی مادھو ڈے
(۲۱) سنگباد پرچن چند رائے	۱۸۳۵	۲ "	ہور و چندر بنرجی
(۲۲) سنگباد سودھا سندھو	۱۸۳۶	۱ "	کالی شنکر دت
(۲۳) سنگباد دیبا کار	۱۸۳۶	۱/۲ "	گنگا نرائن بوس
(۲۴) سنگباد گنگار	۱۸۳۶	۶ "	گوش چندر بوس

۱۸۳۹ء میں کلکتہ سے ۲۶ انگریزی زبان کے اخبارات شائع ہو رہے تھے۔ ان میں پھر روزنامے بھی تھے۔ یہی ہیں اخبارات

کی یہ فراوانی تو نہ تھی مگر پھر بھی وہاں سے دس انگریزی اخبارات نکل رہے تھے۔ مدراس کا بھی کم و بیش یہی حال تھا وہاں سے نو انگریزی اخبارات شائع ہوتے تھے۔ کلکتہ، ممبئی اور مدراس کے علاوہ دہلی، آگرہ، لودھیانہ، لولہ بین اور سیرام پور سے ایک ایک اخبار شائع ہوتے تھے۔

سرکاری اخبار کے اجراء کی ضرورت سب سے پہلے بنگال کی حکومت نے محسوس کی تھی جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اب ممبئی کی حکومت نے بھی اس کی ضرورت محسوس کی اور اس سلسلہ میں ایک کمیٹی مرتب کی گئی جس میں ممبئی کے بعض اخبارات کے اڈیٹر بھی تھے۔ حکومت کی اس تجویز پر کافی بحث و محیص ہوئی لیکن اس کو مسترد کر دیا گیا۔ خود لارڈ آکلینڈ بھی اس تجویز کے موافق نہ تھے۔

۱۸۴۲ء میں لارڈ آکلینڈ کی جگہ پر لارڈ الٹرا (Lord Ellenborough) گورنر جنرل مقرر کئے گئے اس سے پہلے وہ بورڈ آف کنٹرول (Board of Control) کے صدر رہ چکے تھے۔ ان کو اخبارات کے ساتھ کوئی ہمدردی نہ تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اڈیٹروں اور اخبارات کے درمیان ایک وسیع فلیج حائل ہو گئی۔

۱۸۳۵ء میں اخبارات کے متعلق جو قوانین نافذ ہوئے تھے، وہ ۱۸۵۷ء تک بدستور جاری رہے اور ان کے علاوہ کسی نئے قانون کا اضافہ نہیں ہوا۔ اور اس تمام عرصہ میں اخبارات کے اڈیٹروں اور حکومت کے تعلقات بھی ناخوشگوار نہیں رہے۔

۱۸۵۷ء کا زمانہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا اہم ترین باب ہے۔ کیونکہ حکومت نے جوں ہی خطرہ کو محسوس کیا، فوراً اخبارات پر پابندیاں عاید کیں۔ ایک نیا قانون نافذ کیا گیا جو ۱۸۳۳ء کے قانون سے بہت کچھ ملتا جلتا تھا۔ اب اخبار کے اجراء کے لئے اجازت نامہ حاصل کرنا ضروری تھا۔ حکومت 'اجازت نامہ' جاری کرنے میں اپنے اختیارات خصوصی کا پورا استعمال کرتی۔ اس قانون کے نفاذ کے ساتھ ہی ۲۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو بنگال ہرکارہ کا اجازت نامہ منسوخ ہوا۔ اور دوسرے ویسی اخبارات اس قانون کا شکار بنے۔ بہتوں پر بغاوت پھیلانے کے جرم میں مقدمہ چلایا گیا۔ یہ قانون ہندوستانی اور یورپی اخبارات کے لئے یکساں تھا۔ ۱۸۵۷ء کی خونریزی کے ایام میں انگلو انڈین اخبارات کا لہجہ سجدہ تلخ رہا۔ اس کا اندازہ ہم کو اس تحریر سے ہوتا ہے جو اس حادثہ خونیں کے چھ سال بعد سر جارج ٹریویلیان (Sir George Trevelyan) نے لکھی تھی:-

"اخبارات کا لہجہ سجدہ خوفناک تھا۔ انیسویں صدی کے وسط میں عیسائیوں اور انگریزوں نے خونریزی کے لئے جو شور مچایا ہے اس کی مثال ان کی پوری تاریخ میں نظر نہیں آتی۔ انقلاب فرانس کے پر آشوب زمانہ میں ہربرٹ (Herbert) اور مرآت (Marat) نے جو شاندار مگر بے رحمانہ مضامین لکھے تھے۔ ان کی ان مضامین کے سامنے کوئی اہمیت نہیں تھی جو کلکتہ کے بعض اخبارات کی فائل میں موجود ہیں۔"

انگلو انڈین پریس نے ۱۸۵۷ء کے قیامت خیز زمانہ میں حکومت کے لئے بہت مشکلیں پیدا کیں۔ ۲۵ جون ۱۸۵۷ء کو فرنڈ آف انڈیا کے اڈیٹر نے ایک افتتاحیہ "پلاسی" کی صد سالہ برسی کے عنوان سے لکھا۔ اس مضمون میں برطانوی اقتدار کو

تاریکی

رات تھی — اور پھر دیرانے کی اندھیری رات۔ ہر شے سہمی ہوئی، سمٹی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ کائنات کا ذرہ ذرہ تاریکی میں تحلیل ہو رہا تھا، پاس ہی ہلکی ہلکی سرگوشیوں کی آواز آرہی تھی۔

”مجھے یقین نہیں تھا کہ تم آؤ گی“

”یقین نہیں تھا؟“ لہجہ میں مایوسی کا انداز تھا جو بہت جلد تاریکی میں گھل کر اور بھیا نک ہو گیا۔

”ہاں!“

”تو تم کیوں آئے؟“

”اسی لئے کہ یقین نہیں تھا!“

”مجھے ڈرتے تھے؟“

”تمہیں مجھے نفرت تو نہیں؟“ لہجہ میں سب کچھ تھا سوائے بے قراری کے۔

”نفرت؟“ ایسا معلوم ہوا جیسے اسے کسی چیز کی کمی کا فوری احساس ہوا ”یہی تو میری کمزوری ہے، میں کسی سے نفرت

نہیں کر سکتی۔“

”تم سب کو چھوڑ کر آئی ہو تمہیں اپنے اس فعل پر اس وقت پشیمانی تو نہیں؟“ اس دفعہ البتہ لہجہ میں کچھ بے قراری تھی۔

”ہوئی، مگر میرے خیالات ایک مرتبہ علی دنیا میں آنے کے بعد پھر خیالات کی دنیا میں جانے کے عادی نہیں“

”تمہیں غم تو نہیں ہے؟“ وہ چپ رہی، شاید اس نے چاروں طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا ہو — ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

”چپ کیوں ہو گئیں؟“

”انسان اپنی سب سے بڑی تمنا برآنے کے بعد خوش ہو سکتا ہے؟“

”تمہیں کسی کے تعاقب کا تو ڈر نہیں؟“ اس نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا — نہیں کوئی نہیں آ رہا تھا۔ ہر طرف خاموشی

چھائی ہوئی تھی۔ اس قدر گہری خاموشی کہ اگر کوئی رینگتا ہوا بھی آتا تو پتہ چل جاتا۔

”میرا مطلب یہ ہے کہ تمہیں آدمیوں سے — سماج سے تو ڈر نہیں“

”میں کسی سے نہیں ڈرتی۔ صرف وقت سے ڈرتی ہوں۔ جو کچھ ہوتا ہے وقت کے ماتحت ہوتا ہے۔ اس وقت جو شخص آئے گا وہ

خطرناک نہ ہوگا جو کچھ ہونا ہوگا وہ وقت کے مطابق ہوگا۔ مجھے وقت سے ڈر لگتا ہے۔ ہر چیز اس کے سانچے میں ڈھل کر مہلک اور خطرناک

بن سکتی ہے۔۔۔۔۔ وقت! وقت! یہ البتہ رینگتا چلا آ رہا ہے۔ کوئی پتہ نہیں چلا سکتا کہ کیا ہونے والا ہے۔ یہ رات۔ یہ خاموشی

سب وقت کی وسعت میں گم ہے۔ یہ سب کسی فوری حملہ کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔۔۔ مجھے یہاں سے جلدی نکال لے چلو۔۔۔ اندھیرے میں میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔۔۔ دو سائے ایک دوسرے سے مل گئے۔
 ”اب بھی وقت سے ڈر لگ رہا ہے؟“

”نہیں! اس وقت میں ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد ہوں۔“ پھر علیحدہ ہو گئے۔

”مجھے پھر ڈر لگ رہا ہے۔۔۔۔۔ کوئی بڑھتا چلا آ رہا ہے۔۔۔۔۔ جلدی چلو وقت بہت کم ہے۔“
 ہلکی ہلکی چاپ سنانی دی۔ وہی دو سائے متحرک ہوئے، تاریکی کی چادر میں جنبش سی ہونے لگی وہ چلتے گئے۔۔۔۔۔ چلتے گئے۔ یک ایک وہ رُک گئے۔

”کوئی آ رہا ہے!“

”آنے دو“

”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ رُک نہیں۔۔۔ خدا کے واسطے رُک نہیں۔ تم قدموں کی آواز نہیں سن رہے ہو؟؟؟“

یکایک ایک سنانی چیخ کی آواز فضا میں بلند ہوئی۔ کائنات کا ذرہ ذرہ لرز گیا۔

”وہ آگیا!!“۔۔۔ مرد مبہوت کھڑا تھا، عورت لرز رہی تھی۔

”کہاں چھپ کر بھاگے جا رہے تھے؟“۔۔۔ آنے والا بولا۔ اس کی آواز بھاری اور کڑوتھی تھی۔ منہ سے شراب کے بھپکے نکل رہے تھے۔ اس کے آنے سے تاریکی اور بڑھ گئی۔ تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ ایسا معلوم ہوا تھا کہ رات بھی اس سوال کا کوئی جواب سوچ رہی ہے۔ وہ پھر بولا۔ ابکی اس کی آواز میں ایک جابرہ دم کا انداز تھا جس نے کسی مجرم کو گرفتار کر لیا ہو۔
 ”اور یہ تمہارے پیچھے کون کھڑا ہے؟“

”یہ۔۔۔ یہ تو تاریکی ہے۔“۔۔۔ تاریکی میں جنبش ہوئی اور وہ سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔

”میں عورت ہوں۔ بس اس سے زیادہ جاننے کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے۔“ اس کی لرزتی ہوئی آواز میں ارادہ کی پختگی پوشیدہ تھی۔

”تم اس غیر مرد کے ساتھ کیوں جا رہی ہو؟“

”غیر مرد!“ وہ ہنسی ”جس کے دماغ میں اتنا گودا نہیں کہ سمجھ سکے کہ عورت ہمیشہ غیر مرد ہی کے ساتھ باقی ہے اس سے

بات کرنا بھی زندگی کے بیش قیمت لمحات کی بربادی ہے۔“

”ہمارے دماغ میں گودا نہیں ہے! گستاخی اور ہم سے۔ ہم جو انسان کے ہر فعل کے محافظ و نگراں ہیں۔ ہم جو متفقہ طور پر

بہی نوع انسان کے بھی خواہ اور راہبر تسلیم کر لئے گئے ہیں۔ جس کے دربار میں آکر بڑے بڑے سرکشوں کے سر جھک جاتے ہیں۔

جس کے شکنجوں میں پھنس کر بڑے سا بڑا گناہ کا بھی اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیتا ہے۔ جس کے بل بوتے موجودہ دنیا کے تمام

کاروبار چل رہے ہیں۔ جس کے قوی ہاتھوں نے تہذیب و تمدن کی بنیاد ڈالی جو انسان کو نیک اور صحیح طرز زندگی کی تعلیم دیتا ہے

۔۔۔ ہم سے زبان لڑائی جا رہی ہے۔ لڑکی تو اکیلی ہے اور ہماری طرف ساری خدائی ہے۔“ وہ رُکا۔ اس کا سینہ غصہ سے

پھول رہا تھا رات کے دامن میں مرد و جزر کی سی کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ دونوں اس کے سامنے دوڑاؤ ہو جائے

نگاہ بازگشت

(بہ سلسلہ ماہ جولائی ۱۹۶۱ء)

۳۔ اثر لکھنوی جناب مرزا جعفر علی خان صاحب اثر لکھنوی کے شعر میں امتیازی درجہ رکھتے ہیں۔ ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ باوجود عزیز کے شاگرد ہونے کے آپ کے یہاں المیہ شاعری کے عناصر بہت کم پائے جاتے ہیں۔ آپ کا کلام پاکیزگی و متانت کے دورے ہے اور اگر اس میں شوخی بھی ہے تو داغی اسکل کی نہیں ہے۔ جناب اثر نے معلوم ہوتا ہے، حسن کا بھی مشاہدہ کیا ہے اور عشق کا بھی۔ آپ کے جناب اثر کے کلام میں کہیں کوئی بات مذاق سلیم سے گری ہوئی نظر نہ آئے گی۔ عاشقانہ خیالات کا اظہار غزل کا جزو لاینفک ہے، مگر محبت کا تعلق صرف شاہد بازاری سے نہیں ہے اور جناب اثر نے ”عشق و محبت میں بلند و پست کا امتیاز رکھا ہے“ ان کے یہاں صحیح رنگ تغزل موجود ہے مگر بیباک معاملہ بندی نہیں۔ آپ نے اپنے اشعار میں اپنے ذہنی تاثرات و جذبات کو بھی پیش کیا ہے اور محض تقلید و نقالی نہیں کی ہے۔ آپ نے اپنے جذبات کو نرم و سادہ زبان اور دلکش انداز سے پیش کیا ہے۔ فارسی تراکیب بھی خال خال استعمال کی ہیں جو غیر مانوس نہیں ہیں۔

ذیل میں ہم وہ اشعار درج کرتے ہیں جو ان کے صحیح رنگ تغزل کی عکاسی کر رہے ہیں۔ ملاحظہ ہو:-
 دیکھو نہ آنکھ بھر کے کسی کی طرف کبھی تم کو خبر نہیں جو تمھاری نظر میں ہے
 ڈبڈبا آئیں خود بخود آنکھیں بارہا ایسا اتفاق ہوا
 ادھر دیکھ لینا - ادھر دیکھ لینا پھر ان کی طرف اک نظر دیکھ لینا
 کچھ روز یہ بھی رنگ رہا انتظار کا آنکھ اٹھ گئی جدھر بس ادھر دیکھتے رہے
 قاصد پیام ان کا نہ کچھ دیر ابھی سنا رہنے دے محو لذت ذوق خبر مجھے
 عشق سے لوگ منع کرتے ہیں جیسے کچھ اختیار ہے اپنا
 شاعر نے ”جیسے کچھ اختیار ہے اپنا“ کہہ کر اپنی انتہائی مجبوری و بے بسی کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس مصرعہ کی معنویت داد کے قابل ہے۔

امید ہر شخص کے لئے سرمایہ تسکین ہوتی ہے۔ مگر جناب اثر کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

دلِ غم دیدہ کانپ کانپ اٹھتا یا اس کے بعد جب امید ہوتی

اس شعر میں موصوف نے اپنے انتہائی یاس و ناامیدی کی تصویر کھینچی ہے۔

غزل کا یہ ایک عام مضمون ہے کہ شاعر اپنے دردِ دل کا اظہار کبھی زبان سے کرتا ہے۔ کبھی آنکھوں سے اور کبھی اپنی

صورت خاموش ہے۔ جناب اثر بھی اپنے یہاں اس مضمون کو پیش کرتے ہیں مگر بالکل نئے انداز سے۔ ملاحظہ ہو:-

پوچھنے والے در پہاں کے اپنے چہرہ کا رنگ بھی دیکھا؟
تعبیر شاعرانہ کی ایک اور اعلیٰ مثال ملاحظہ ہو:-

ہوئی مدت کہ اُس نے ناز سے دامن کو جھٹکا تھا ابھی تک موبہ گل کی پریشانی نہیں جاتی۔
اس قسم کے اشعار جناب اثر کے دیوان میں اور بھی ملتے ہیں۔ آپ کا رنگ تغزل پاکیزہ اور نکھرا ہوا ہے جس میں شوخی بیان ایک قسم کی لطافت اور صحیح تغزل پیدا کر دیتی ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

اب میں سمجھا مراد جنت سے آپ جس راہ سے گزر جائیں،
محر و میوں کے ہوتے سرشاری تمنا کچھ اُن کی شوخیاں ہیں۔ کچھ اپنی سادگی ہے
یہ بھیگی رات اور یہ برسات کی ہوائیں جتنا بھلا۔ با ہوں وہ یاد آ رہا ہے
فن شعر میں محاکات کا رنگ خاص طور سے پسند کیا جاتا ہے۔ جناب اثر کا حسب ذیل شعر دیکھئے اور قوت مشاہدہ اور قوت بیان کی داد دیجئے:-

نظر سوئے زمیں ہے گوشہ دامن ہو ہاتھوں میں معاذ اللہ کوئی کیا کہے ایسے پیشیاں کو
جناب اثر کی شاعری میں ایک کیفیت ضرور پائی جاتی ہے مگر سامعہ کو اپنے اندر جذب کرنے سے قاصر ہے۔ ایک شخص جناب اثر کے شعر سنکر تھوڑی دیر کے لئے مسرور و مخطوط ہو سکتا ہے مگر وہ اپنے کو ان میں گم نہیں کر سکتا۔ اثر کی شاعری دل سے زیادہ دماغ پر اثر کرتی ہے۔ ان کے کلام میں جوش و سرستی کی کمی ہے اور کہیں کہیں خامیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ ایک شعر ملاحظہ ہو:-

ایک سجدے سے زیادہ عشق میں جائز نہیں در نہ آلودہ جبین بندگی ہو جا سئے گی
دوسرے مصرعہ میں صرف لفظ آلودہ استعمال کیا ہے جس سے کسی مفہوم کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ شعر سے یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ جبین بندگی کس چیز سے آلودہ ہو جا سئے گی۔ لفظ ”آلودہ“ اگر کسی اور لفظ سے ترکیب دیکر استعمال کرتے تو شاید کوئی مفہوم پیدا ہو سکتا آلودہ گناہ یا آلودہ سجدہ، یا آلودہ خاک یا اور کچھ جو بھی وہ کہنا چاہتے ہوں۔ اک اور شعر ہے:-

ایمان غلط - اصول غلط - ادعا غلط انسان کی دلہی اگر انسان نہ کر سکے
اس شعر میں بھی نہ معلوم صرف ادعا کہہ کر کس چیز کا دعوے مراد لیا ہے۔ ”ادعا“ کا صراحت کے لئے اُس کے ساتھ ارعائے انسانیت یا اور کوئی ترکیب استعمال کرنا ضروری تھا۔

مندرجہ بالا دونوں اشعار کمزوری بیان کی غمازی کر رہے ہیں۔ ایک شعر ہے:-

جب ہتیلی سے ملی جائیں وہ آنکھیں دیکھو مے یونہیں بھرتے ہیں اس طرح کے پیمانوں میں
پہلا مصرعہ میں ”جب ہتیلی سے ملی جائیں“ کہہ کر ایک آنے والے وقت کی طرف اشارہ کیا ہے (کہ جب ایسا ہو تب دیکھو) اور دوسرے مصرعہ میں فعل حال استعمال کیا ہے کہ ”مے یونہیں بھرتے ہیں اس طرح کے پیمانوں میں“ اور یہ انداز بیان کا ایک تقم ہے۔ اگر اسے یوں کہتے تو یہ عجیب دور ہو جاتا:

وہ ہتیلی سے ملی جاتی ہیں آنکھیں دیکھو مے یونہیں بھرتے ہیں اس طرح کے پیمانوں میں

کوئی موسم ہو۔ سماں ہو کہ تغیر کوئی تم کو جب دیکھ لیا وقت فراغِ موشس ہوا
اس شعر میں بھی لفظ ”تغیر“ اس قدر جامعیت لئے ہوئے ہے کہ شعر میں کوئی خاص مفہوم پیدا نہیں ہوتا۔ خدا معلوم یہاں
صرف تغیر کہہ کے کس چیز کا تغیر مراد لیا ہے ؟

۴۔ احسان دانش احسان ایک نظم گو شاعر ہیں۔ غزل اُن کا موضوع نہیں ہے، اس لئے ان کی غزلوں میں بھی نظموں
کا انداز نظر آتا ہے۔ اُنھوں نے مزدوروں کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے اور اس لئے اگر ہم انھیں
”مزدور شاعر“ کے لقب سے یاد کریں تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔ ان کی زندگی اور شاعری میں اس قدر زیادہ مطابقت پائی جاتی ہے کہ ہم انھیں
بلاشبہ حقیقی شاعر کہہ سکتے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں صرف اپنی ذاتی مشکلات و اذیت کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ سارے جہاں کے
درد کو اپنی شاعری میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ آپ کی آواز میں ایک سوز و اثر ہے جو دل میں تیر و نشتر کی طرح پیوست ہو جاتا ہے
لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ احسان کی شاعری یکسر قنوطیت سے لبریز ہے۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعہ سے اظہارِ رنج و غم نہیں کرتے
بلکہ اپنے حقیقی تاثرات کو نظم کر کے دل کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں۔ وہ دنیا کی بے التفاتیوں اور اُس کے فریب کو بتا کر دنیا والوں کو دنیا سے
متنفر کرنا نہیں چاہتے۔ وہ دنیا کو بزدل اور بے عمل بنانا نہیں چاہتے۔ اُن کا زاویہ نظر تعمیری ہے۔ تخریبی نہیں۔ وہ ہندوستان کی
معاشرت اخلاق اور سماج میں اصلاح کرنا چاہتے ہیں اور اس لئے وہ انسان کی معاشرتی اور اخلاقی کمزوریوں سے ہمیں تنبہ
کرتے ہیں۔

احسان نے اپنے کلام کا انتخاب غالباً بادل ناخواستہ کیا ہے یا عجلت میں۔ اس لئے کہ اشعار کی تعداد بھی کم ہے اور ہمیں اُنکے
بہت سے ایسے اشعار نظر نہیں آتے جن کو ان کے انتخاب میں سب سے پہلے ہونا چاہئے تھا۔ مثلاً :

نگاہ شوق میں تابِ جمال ناممکن تجھے وہ دیکھ سکے جو امیدوار نہ ہو
ترے خیال کی تابانیاں ارے تو بہ کہ شام آئے تو سینہ میں روشنی ہو جائے
دل پھر چلا ہے لیکے ترے آستان کی سمت اپنی شکستگی کا سہارا لئے ہوئے
پھر وہ یاد آئے۔ ہوئی مہوش دل کی کائنات پھر اٹھا دردِ جگر۔ پھر کچھ مجھے آرام ہے
اب تو کچھ ایسا رہیں دور اندیشی ہے دل جب خوشی کا نام آتا ہے تو تھرتا ہوں میں
خدا کے لئے اب تو بالیں پہ آؤ، دعا کر رہے ہیں دعا کرنے والے
ہائے وہ رات کی جاگی ہوئی آنکھوں کا خار جیسے برسات میں عالم کسی میخانہ کا
بڑھے جو عقل کا معیار کفر پیدا ہو جنوں کو وجد جو آئے۔ پیمبری ہو جائے

مندرجہ بالا اشعار وہ ہیں جو اُن کے صحیح رنگِ تغزل کو پیش کرتے ہیں۔ خدا معلوم یہ اشعار احسان صاحب کی نگاہِ انتخاب
میں کیوں نہ آئے۔ غالباً یہاں بھی اُن کا وہی رجحان جو نظم کی طرف ہے کارفرما تھا اور اسی لئے انھوں نے زیادہ اپنے اُن
اشعار کا انتخاب کیا ہے جو نظم کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ تاہم انھوں نے اپنے رنگِ تغزل کے بعض اچھے نمونے اپنے انتخاب میں بھی
پیش کئے ہیں، چند اشعار ملاحظہ ہوں :

نہ جاسے محبت کا انجام کیا ہے میں اب ہر تسلی سے گھبرا رہا ہوں

بھٹکا ہوں اپنی منزل مقصد سے بار بار
آسان دیکھ کر کبھی دشوار دیکھ کر
ہو سوئے آسمان جو دُعا کے لئے بند،
یہ پستیاں کہاں مرے دست سوال میں

احسان کی غزلیات میں تقلید کا عنصر بہت کم پایا جاتا ہے۔ آپ کے یہاں تنوع و وسعت مضامین اور ندرت بیان کی فراوانی ہے۔ آپ نئی باتیں پیش کرتے ہیں اور اس کے لئے نیا انداز بیان بھی مگر ایسا جس کا لب و لہجہ مانوس ہو اور ذوق سلیم پر ناگوار نہ ہو۔

ان کے تغزل میں کہیں کہیں لطیف شوخی بھی نمایاں ہے جیسے :

یہ اڑی اڑی سی رنگت، یہ کھلے کھلے گیسو
ترے صبح کہہ رہی ہے تری رات کا فساد
کہیں گلشن کہیں قوس قزح کی رنگ نشانی
حکومت ہے تری رعنائیوں کی چشم انساں پر
چاند کیا شے ہے ترا دھندلا سا اک نقش قدم
چاندنی کیا ہے تری گردِ خرام ناز ہے

جناب احسان کا کلام باوجود کم مشقی کے نہایت پاکیزہ اور مستحضر ہے۔ بندش کی چستی۔ الفاظ کی تلاش۔ تراکیب کا استعمال۔ جدت ادا۔ اسلوب بیان۔ اور ندرت مضامین غرض ہر پہلو سے آپ کے صحیح مذاق شاعری کا اندازہ ہوتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ کے یہاں خامیاں نہیں ہیں مگر ان کی مشق کی عمر اور ان کے کلام کی خوبیوں کو دیکھتے ہوئے یقیناً نظر انداز کرنے کے قابل ہیں۔

۵۔ علی اختر اختر دورِ حاضر کے ایک خوش فکر شاعر ہیں۔ فارسی اور عربی کی تعلیم کے علاوہ زمانہ کی مروجہ تعلیم کے مطابق اسکول اور کالج کی فضا بھی دیکھی ہے۔ آپ ایک کامیاب نظم گو شاعر ہیں۔ آپ کا انتخاب کلام دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو فارسی میں اچھا فاضل درک حاصل ہے اور یہی ذوقِ فارسیت ہے جو آپ کی غزلیات میں بھی نمایاں ہو جہاں تک اس حصہ انتخاب کا تعلق ہے جو اس وقت پیش نظر ہے ہر شخص اس کو دیکھنے کے بعد یہ کہنے پر مجبور ہو جائے گا کہ جناب علی اختر کو فارسی تراکیب اور فارسی الفاظ کو اپنے اشعار میں استعمال کرنے کا زیادہ شوق ہے اور یہی سبب ہے کہ آپ کی غزلیات میں وہ اثر نہیں جو تغزل کے لئے مخصوص ہے۔ آپ کے انتخاب اشعار میں شاید ہی چند شعرا ایسے ہوں جس میں فارسی تراکیب استعمال نہ کی گئی ہوں اور یہ خصوصیت آپ کے رجحانِ طبعی پر کافی روشنی ڈالتی ہے۔ بقول محترم مدیر نگار ”جب کوئی پڑھا لکھا آدمی غزل میں اپنی قابلیت کے اظہار پر آجاتا ہے تو غزل کو بالکل برباد کر دیتا ہے“ یہی حال جناب علی اختر کا ہے۔ گو اس میں شک نہیں کہ آپ نے نئے نئے اسلوب بیان، ندرت مضامین اور علوئے تخیل سے کام لیکر اپنی شاعری کی طرف لوگوں کو متوجہ ضرور کیا ہے۔ مگر آپ کا کلام کیفیت و اثر سے خالی ہے۔ البتہ جہاں جہاں فارسیت کی آمیزش کم ہے وہاں اُن کے کلام میں کافی دلکشی پائی جاتی ہے علی اختر کے حسب ذیل اشعار میں آپ دیکھیں گے کہ فارسی تراکیب غیر مانوس ہیں اور ذوق پہ بار۔ ملاحظہ ہو :

دل میں اب تاب ضبط بھی تو نہیں
آپ کیوں یاد آئے جاتے ہیں
حریم کعبہ بنادی وہ سرزمین میں نے
ترے خیال میں رکھ دی جہاں جہیں میں نے
اللہ سے بخودی خبر دو جہاں نہیں
اب زندگی بہ قید زمان و مکاں نہیں
نہیں اسے ہنفس بے وجہ میری گریہ سامانی
نظر اب واقعہ راز تبسم ہوتی جاتی ہے
حریف جادہ دشوار بن اور کراتا جا
کمشکل میں اصل میں منتی جو حرف احساس مشکل سے

مری نگاہ سے چھپ کر خوش رعایت ذوق
مبارک ہیں اُس دل کی دیرانیاں
جنہیں تیرے تصور سے آباد ہے
جناب اختر کے یہاں اُن کے مذاق فارسیّت کی بدولت کہیں کہیں البتہ زور بیان اور جوش کی جھلک ضرور نمایاں ہو جاتی ہے اور شعر کا لب و لہجہ اور نیکھاپن شعر میں ایک خاص کیفیت پیدا کر دیتا ہے:

عشق کی لطافت کو خاک طور کیا جانے
مجھ پہ تھی نظر اُن کی مجھ سے تھا خطاب اُن کا
بخود می نے توڑ دیں جب عشق و عرفاں کی حدیں
خود بخود بہرِ نظم دانش و دل ہو گیا
عام ہو جائے اگر لذتِ غم
ذرہ خاک بیا باں ہو جائے
بعض اشعار میں خامیاں بھی ہیں مثلاً:

جنوں نے فاصلہ رکھا نہ کوئی عشق و عرفاں میں
گریباں کے عوض اب ہاتھ الجھتا ہر گرجاں میں
ہاتھ کا رگ جاں میں الجھنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔
ایک اور شعر ملاحظہ ہو:

بتا اسے جنوں گمرانِ خرد کو
یہ دانا ئیاں ہیں کہ نادانیاں ہیں
: معلوم لفظ "یہ" کس کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ میرے خیال میں یہ حشو ہے اور مصرعہ کو پورا کرنے کے لئے رکھا گیا ہے
ایک اور شعر:-

بکھر رہے ہیں ابھی سے حیات کے اجزاء
ابھی تو دوش پہ وہ کا کل دراز نہیں
اس شعر میں بھی خدا معلوم کن چیزوں کو حیات کے اجزاء سے تعبیر کیا ہے؟ اور وہ کیونکر بکھر رہے ہیں اس کی کوئی توضیح نہیں۔
غالباً بالوں کے دوش پر بکھرنے کی رعایت سے اجزائے حیات کے بکھرنے کو مصرعہ اولے میں نظم کیا ہے۔ اس شعر میں سوائے رعایت لفظی کے اور کوئی بات نہیں ہے۔

گرم رقص ہیں اختر نام سے اجزاء
زندگی حقیقت میں خوابِ زندگانی ہے
پہلے مصرعہ میں صرف اجزاء کہہ کر غالباً اجزائے زندگی مراد لیا ہے۔ اجزائے زندگی کا کیا مفہوم ہے اور وہ کیونکر گرم رقص میں ہیں۔ اس کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ زندگی کے اجزاء اگر رقص میں بھی ہیں تو اس کو سبب قرار دیکر زندگی کو خوابِ زندگانی بتانا کہاں تک درست ہے اور پھر زندگی کو زندگی ہی کا خواب بتانا بھی عجیب بات ہے۔

دنیا کی شورشلوں سے مرجھا چلی ہیں نبضیں
ہاں! مطربِ محبت! اک نغمہ جوانی
نبضوں کا مرجھانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اور محاورے کے خلاف ہے۔ نبضیں ڈوب جانا نبضیں ساقط ہونا
محاورہ ہے نبضیں مرجھانا کوئی محاورہ نہیں ہے۔

۶۔ اختر شیرانی
جناب اختر شیرانی نے اپنے سوانح حیات پر کوئی روشنی نہیں ڈالی ہے جس سے آپ کے رجحان طبع کا کوئی صحیح اندازہ ہو سکتا۔ آپ ایک نظم گو شاعر ہیں مگر غزل بھی آپ کا موضوع ہے۔ آپ کی غزلوں میں نہ مضمون آفرینی ہے نہ علوئے خیال۔ نہ فلسفہ ہے نہ تصوف۔ بلکہ آپ کی شاعری وہ "بادۂ وساغریں جسے"

چند اشعار ملاحظہ ہوں :

اُس کے عہدِ شباب میں جینا! بے والو تمہیں ہوا کیا ہے
 ستم ہے کہ اسے دل نہیں جاودانی حسینوں کا حُسن اور ہماری جوانی
 یہ مچھلک کے بھی اُس حُسن کو پہنچ نہ سکی یہ پھول کھل کے بھی اُس کا شباب ہونہ سکا

آخر شیرانی کا محبوب کھلم کھلا طبقہ انات سے تعلق رکھتا ہے۔ ملاحظہ ہو :

قبر پر آئی ہے وہ پسیر ناز عمر سانی کو دے کوئی آواز
 صدمہ دیکھ نہ لے کوئی یہ بھیگا آنجل میری چغلی کہیں کھاویں نہ تمہارے آنسو
 مگر کہیں کہیں عام شعراے اُردو کی طرح اپنے محبوب کے لئے افعال و ضمائر مذکر ہی استعمال کئے ہیں۔ آپ کے کلام میں ایک ایسا کھلند ٹاپن پایا جاتا ہے جو ذوقِ سلیم پر بار ہے۔

لیکن چونکہ آپ کی شاعری جذباتی ہے اسی لئے جہاں جہاں آپ نے کچھ سنبھل کر کہا ہے وہ بہت خوب ہے۔ جیسے :-

کیا کہ گئی کسی کی نظر کچھ نہ پوچھے کیا کچھ ہوا ہے دل پہ اثر کچھ نہ پوچھے
 دل میں خیال نرگس جانا نہ آگیا پھولوں سے کھیلتا ہوا دیوانہ آگیا
 پارسائی کی جواں مرگی نہ پوچھ توبہ کرنی تھی کہ بدلی چھسائی

جناب امید امیٹھویؒ کے رہنے والے ہیں مگر آپ کا قیام زیادہ تر لکھنؤ میں رہا ہے اور آپ وہاں کے خوشگو شعرا میں شمار کئے جاتے ہیں۔ آپ نے عربی کے علاوہ خاص طور پر فارسی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور اس زبان میں اس قدر مہارت پیدا کی کہ آپ اس زبان میں بلا تکلف شعر کہتے ہیں۔ اُردو میں آپ کا کوئی خاص رنگ سخن نہیں ہے۔ آپ کا کلام نہ بہت زیادہ بلند ہے نہ بہت زیادہ پست۔ انتخابِ کلام سے مشاطی ضرور نمایاں ہے۔ آپ حضرت جلال لکھنوی کے شاگرد رہ چکے ہیں مگر آپ کے کلام میں وہ چٹیل اپن، شوخی اور سادگی جو جلال مرحوم کا طرہ امتیاز تھی نظر نہیں آتی اور اس کے متعلق وہ خود اپنے سوانح حیات میں لکھتے ہیں کہ ”میں اپنی فارسی دانی اور افتادِ طبیعت کی وجہ سے نئی نئی چیزیں استعمال کرنے کا خوگر اور ہمارے حضرت جلال وہی سیٹھی بھکی سیدھی سادہ اُردو غزل گوئی کے دلدادہ تھے“ اس فقرہ سے آپ کی رجحانِ طبیعت اور مذاقِ شاعری کا صحیح اندازہ ہوتا ہے کہ آپ سادگی بیان کے مقابلہ میں اشکالِ الفاظ کو زیادہ پسند کرتے ہیں، اور غالب کے طرزِ سخن کے دلدادہ ہیں۔ آپ کا حسبِ ذیل شعر آپ کی افتادِ طبیعت کو اچھی طرح ظاہر کرتا ہے :

ادھر اک برقِ حاصل سوزِ گرم سب سے بے حال ادھر محرومِ حاصل کر دیا تحصیل حاصل نے

اور اگر اسی شعر کو آپ کا حاصل مذاق شعر کہا جائے تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔ مگر ہمیں تعجب ہے کہ آپ کے کلام میں بجز مندرجہ ذیل چند تراکیب ”بے نیاز آگئی، خلیل بے نیازی، کلفتِ فراموسی، سادگی اعتبارِ یاس، حُسنِ جلوہ مائل، لب کاوش تقاضہ، حجابِ نیم حائل“ زیادہ فاسیت نظر نہیں آتی۔ (اور پھر یہ تراکیب کچھ زیادہ غیر مانوس بھی نہیں ہیں) لیکن آپ کے اچھے اشعار زیادہ تر وہی ہیں جو زبان کے لحاظ سے بہت نرم و سہل اور سادہ ہیں۔ ملاحظہ ہو :

خوش نصیبی کا اُس کی کیا کہنا، تم ہو دنیا میں جس کسی سے خوشش

اللہ رے قریب تمنا کہ بار بار اپنے ہی خط کو لیکے پڑھا نامہ برسے آپ
میری طرح بھی محو تماشائے ہو کوئی، یوں کسی کی بزم میں گویا نہیں ہوں میں
نام شکر خوشی کا اے اُمید رنج ہوتا ہے اب خوشی کیسی
یہ اور بات ہے رنجیدہ ہو گئے اُمید تری طرت سے تو خاطر میں کچھ کمی نہ ہوئی،
عجیب بات ہے اُمید دل کی باتوں کا نہ اعتبار اُنھیں ہے نہ اعتبار مجھے
جناب اُمید کے کلام میں کہیں کہیں خامیاں بھی نظر آتی ہیں۔ آپ کا ایک شعر ہے:
حُسن بے پردہ دماغ امتحاں رکھتا نہیں فیصلہ عشق و ہوس کا ورنہ کچھ مشکل نہیں،
مندرجہ بالا شعر میں تقابل ردیفین کا بڑا عجیب موجود ہے جو سماعت کو بہت ناگوار معلوم ہوتا ہے۔
آپ کا ایک اور شعر ہے:

کوئی ہوش ہی میں نہ تھا ورنہ ساقی جو کہنا نہ تھا کہہ گیا سرخوشی میں،
یہاں بھی جناب اُمید کی فارسی دانی نے انھیں دوسرے مصرعہ میں بجائے ”خوشی“ کے ”سرخوشی“ استعمال کرنے پر
مجبور کیا۔

بیخود دہلوی جناب بیخود دہلوی، داغ مرحوم کے شاگرد ہیں۔ آپ نہایت کہنہ مشق شاعر ہیں اور آج بھی آپ کا رنگ
شاعری وہی ہے جو حضرت داغ کے زمانہ کے لئے مخصوص تھا۔ آپ اپنی وضع کے بہت پابند ہیں اور
اپنے اُسی پرانے رنگ شاعری کو نباتتے چلے آ رہے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ خود کہتے:

اس وقت تک تو وضع میں آیا نہیں ہوا فرق تیرا کرم شریک جو پروردگار رکھتا
اس لئے آپ کی شاعری کو موجودہ رجحانات کی روشنی میں دیکھنا سخت نا انصافی ہوگی۔ آپ کے کلام میں داغ مرحوم کا رنگ
شاعری بہت زیادہ جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ مثلاً:

جب تک تھا دل میں آپ کے اقرار وصل تھا جب آگیا زبان پر انکار ہو گیا
کہیں تنہا بھی نہ تھا۔ رات اندھیری بھی نہ تھی قتل میں تو سر بازار سہر شام ہوا
رات بھر شمع کی مانند جلایا شب وصل رات بھر کا وہ سمجھتے رہے کہاں مجھ کو
ہاتھ سے ذبح کرواٹھ نہیں سکتی جو چھری ہم تو بے موت بھی موجود ہیں مرنے کے لئے
وہ سُن کر حور کی تعریف بردے سے نکل لئے کہا پھر مسکرا کر حُسنِ زیبا اس کو کہتے ہیں
بلاؤ بزم میں غیروں کو تم اس کی ضرورت کیا جہاں تم ہو، جہاں ہم ہوں وہاں سارا جہاں کیونچ

مگر جناب بیخود نے جہاں تقلید سے ہٹ کر کچھ کہا ہے وہ حسن بیان۔ طرز ادا اور زبان کی شستگی اور صفائی میں اپنا جواب نہیں
رکھتا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

راہ میں بیٹھا ہوں میں تم سنگ رہ سمجھو مجھے
 آدمی بن جاؤں گا کچھ ٹھوکریں کھانے کے بعد
 بھری محفل میں حسن و عشق کا باہم اثر دیکھا
 کبھی اُسے ادھر دیکھا کبھی ہم نے ادھر دیکھا
 موسیٰ کی طرح اور بھی ہیں طالب دیدار
 جب جلوہ نا طور پہ تھے اب بھی کہیں ہو؟
 میں چشم عنایت کا بھروسہ نہ کروں گا
 سورنگ بدلتے ہوئے دیکھا ہے نظر کو
 شعلہ حسن نے جمنے ہی نہ دی رُخ پہ نظر
 دیکھ کر بھی نہیں دیکھا ابھی گویا تم کو
 ہم نے بیخود تجھے ہنستے ہوئے دیکھا کبھی
 زندگی خواب سہی صرف متانت کیوں ہو
 اسی پہ کہتے تھے قایل نہ ہم کبھی ہوں گے
 یہ کیا ہوا؟ نگہ سراسر کو دیکھو
 دم آخر انھیں ارمان میری زندگی کے ہیں
 وہ اب سمجھے کہ یہ سارے تعلق جیتے جی کے ہیں
 غیر کی بزم سے آئے تھے عیادت کے لئے
 یاد ہے یاد ہے وہ آپ کا احساں مجھ کو

۹- تاجور نجیب آبادی
 جناب تاجور نجیب آبادی دورِ حاضر کے خوش فکر اور خوش گو شاعر ہیں۔ آپ نشر و نظم دونوں میں پاکیزہ مذاق کے حامل ہیں۔ آپ کا انتخاب اشعار فکر بلند، شگفتگی، بیان اور ذوق صحیح کا ثبوت ہے۔ آپ وسیع سے وسیع مضمون کو ایک شعر میں نظم کر دیتے ہیں جس سے آپ کی بلاغت پسندی کا پتہ چلتا ہے آپ کا ایک شعر ہے:

یہ ستم قیدِ نفس میں سیاد
 کس نے پوچھا تھا بہار آئی ہے؟
 ان دونوں مصرعوں میں جناب تاجور نے جس مفہوم کو ادا کیا ہے اُس کی تفصیل و تشریح کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ "یہ ستم" کہہ کر تاجور صاحب نے نہ صرف شدتِ ظلم و ستم کو ظاہر کیا ہے بلکہ اسیروں کی حسرت کا مرقع کھینچا ہے اور پورا مصرعہ اپنے سوز و گداز کے لحاظ سے مجسم ایک آواز در دہے۔ بسا اوقات آپ کے اشعار میں قوتِ بیان اور جوش کی موجودگی شاعر کی شخصیت کو واضح کرتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

جو مجھ سے چھین لیا دہر خود غرض نے تمھیں
 مٹوں گا لیکن اُسے بھی تباہ کر دوں گا
 بے کائنات کا ہر ذرہ ہمنوا میرا
 کچھ ایسا محفل ہستی پہ چھارہ ماہوں میں
 محبوب کی جفا ایک عام مضمون ہے مگر جناب تاجور نے ذیل کے شعر میں اپنے زورِ تخیل اور الفاظ کی نشست سے جو لطف پیدا کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ فرماتے ہیں:

جفاے دوست بنی رہنمائے منزلِ دوست
 وہ لھو رہے ہیں مجھے اُن کو پارہا ہوں میں
 اندازِ بیان کی خوبی کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

ہے میری خاک کے ذروں میں پھر نمودِ حیات
 کہیں اُنھیں تو نہیں یاد آ رہا ہوں میں،
 اس شعر کا پہلا مصرعہ اس قوت کے ساتھ نظم کیا ہے کہ دوسرے مصرعہ میں باوجود ایک کیفیتِ شبہ کے یقین کی صورت نظر آتی ہے۔ اور اس میں "استفہام بالذات" یا "تخاطب بالذات" نہ صرف اظہارِ تعجب کے لئے ہے بلکہ اس میں ایک عنوانِ مسرت بھی پنہاں ہے۔

ان کے اشعار میں نزاکت معنوی اور تخیل بلند کے علاوہ ایک کیفیت بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً :-
 خانہ برباد چمن برسوں قفس میں ہم صغیر آشیاں سے چھٹ کے خواب آشیاں دیکھا کئے
 نہ دل بدلانہ دل کی آرزو بدلی نہ وہ بدلے میں کیسے اعتبار انقلاب آسماں کر لوں
 خلش عشق مٹے گی مرے دل سے جب تک دل ہی مٹ جائیگا ایسا نظر آتا ہے مجھے
 آخر شعر میں ”ایسا نظر آتا ہے مجھے“ حسرت کی انتہائی منزل کی عکاسی کر رہا ہے اور اس مختصر ٹکڑے میں ایک بے پایاں
 سوز و گداز ہے۔

حسب ذیل اشعار آپ کی جدت پسند طبیعت، پاکیزہ مذاق شاعری، مشاہدہ فطرت، زور بیان، عورت ادا، کیف و اثر
 اور نکھرے ہوئے حسن تغزل کو ظاہر کرتے ہیں :

سبب ہر ایک مجھ سے پوچھتا ہے میرے رونے کا الہی ساری دنیا کو میں کیونکر راز داں کر لوں
 تجھ سے میں کیا کہوں اسے سوختہ جلوہ طور دل کے آئینہ میں کیا کیا نظر آتا ہے مجھے،
 کہیں رسوا نہ ہو اب شان، استغنا محبت کی مری حالت تمہارے رحم کے قابل نہ بن جائے
 عبرت آموز ہے بربادی دل کا نقشہ رنگ نیرنگی دنیا نظر آتا ہے مجھے
 جو دیکھتے ہیں تجھے اور دیکھ سکتے ہیں مری نگاہ میں ذوق نظر نہیں رکھتے
 کل تک تھی دل میں حسرت آزادی قفس آزاد آج ہیں تو غم بال و پر ہے آج
 خود داری جنوں نے نہ جانے دیا وہاں کبھت راہ دوست میں دیوار ہو گئی
 زور بیان اور قوت شاعری کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو :

فدا مجھ کو تجھ سے ہی محروم کر دے جو کچھ اور تیرے سوا چاہتا ہوں،
 آپ کا ایک شعر ہے :

نظر بھر کے جو دیکھ سکتے ہیں تجھ کو میں اُن کی نظر دیکھنا چاہتا ہوں
 اس قسم کا انداز بیان جناب تاجور کے یہاں بکثرت پایا جاتا ہے۔

سید علی سجاد قہر - الکر آبادی - بی۔ اے

(باقی)

تذکرہ معرکہ سخن

اپنے رنگ کا بالکل پہلا تذکرہ، جس میں بتایا گیا ہے کہ بڑے بڑے اساتذہ پر کیا کیا اعتراض کئے گئے اور یہ کہ ان کا کوئی جواب
 ہو سکتا ہے یا نہیں۔ یہ تذکرہ انتہائی کاوش کے بعد مرتب کیا گیا ہے اور فن شعر کے متعلق بے بہا معلومات کا ذخیرہ ہے۔
 قیمت علاوہ محصول دور و پیہ آٹھ آنہ (۸)

میجر نگار لکھنؤ

اپن کا مستقبل حال کی روشنی میں

پچھلی خانہ جنگیوں کے بعد سے اب تک اپن کی حالت بہت خراب چلی آرہی ہے اور وہ نہایت سخت اقتصادی دشواری میں مبتلا ہے۔

جرمنی کے ارباب پرو پاگنڈا کہتے ہیں کہ یہ نتیجہ ہے برطانوی ناکہ بندی کا، دراصل ایکہ اپن کو خانہ جنگی کی تباہیوں سے بچانے میں جتنا حصہ برطانیہ نے لیا ہے کسی نے نہیں لیا۔ جرمن پرو پاگنڈا یہاں بڑی قوت کے ساتھ جاری ہے اور اس میں انھیں کچھ کامیابی بھی حاصل ہو رہی ہے جس کے بعض اسباب ہیں۔

اہل جرمنی یہاں کے اخباروں کی تاریخ اور اخبار نویسوں اور کارپردازان ریڈیو کے حالات سے بخوبی واقف ہیں اور وہ صرف ان کی وساطت سے پرو پاگنڈا کرتے رہتے ہیں بلکہ (Falange) جماعت کے ذریعہ سے وہ مزدوروں میں بھی نازی تحریک پھیلا رہے ہیں۔

اس وقت وہاں کی پبلک تین جماعتوں میں منقسم ہے، ایک تو جاہل طبقہ عوام ہے جو جرمنی کو جانتا ہے، نہ انگلستان کو اور دونوں کی طرف سے بدظن ہے، لیکن چونکہ جرمن ان سے کہتے رہتے ہیں کہ محوری طاقتیں سرمایہ داری سے جنگ کر رہی ہیں اس لئے یہ بات یقین کر لینے کو ان کا جی چاہتا ہے۔

دوسرا طبقہ ان قدامت پسندوں کا ہے جو سمجھتے ہیں کہ اگر انگلستان کو شکست ہو گئی تو انفرادی آزادی اور روایتی خاندانی زندگی یورپ سے ختم ہو جائے گی، لیکن وہ برطانیہ کی کامیابی کے لئے کسی جوش کا بھی اظہار نہیں کرتے۔

تیسری جماعت انتہا پسند (Falangists) کی ہے، جو چاہتے ہیں کہ جرمنی جیت جائے، ان میں سے بعض نازی تحریک کے زیر اثر ہیں لیکن اکثر وہ ہیں جو صرف انقلاب کے خواہشمند ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ اگر جرمنی جیت گیا تو شاید ان کو بھی کچھ فائدہ پہنچ جائے، لیکن متفقہ طور پر سب کی خواہش یہی ہے کہ کسی طرح یہ لڑائی جلد ختم ہو خواہ جرمنی جیتے یا برطانیہ چونکہ یہ سمجھتے ہیں کہ نہ برطانیہ، جرمنی کو شکست دے سکتا ہے اور نہ جرمنی، انگلستان پر حملہ کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے، اس لئے خود انھیں جنگ میں براہ راست حصہ لینے سے دلچسپی نہیں، لیکن ایک جماعت انتہا پسندوں اور فیشنلسٹ فوج کے معزول انسروں کی ایسی ضرورت ہے جو یہ چاہتی ہے کہ اپن بھی اس جنگ میں جرمنی کا شریک ہو جائے اور یہ صرف اس لئے کہ اس طرح انھیں فوجوں میں جگہ مل جائے گی اور ان کی بیکاری جاتی رہے گی۔

فوج مجموعی حیثیت سے جنرل فرانکو کی طرفدار ہے اور تمام بڑے بڑے فوجی افسر، فرانکو کے ہمخواہ ہیں اور جنگ میں حصہ لینے کے مخالف ہیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی یقینی ہے کہ اگر جرمنی نے اپن کی طرف سے جبراً لڑنے کا فیصلہ کر لیا تو اپنی فوج

جرمن فوجوں کی راہ میں کامیابی سے حایل نہ ہو سکیں گی۔ ہرچند ابھی تک جرمنی نے کوئی قدم ایسا نہیں اٹھایا اور نہ فی الحال اسکی امید ہے، لیکن اگر آئندہ کسی وقت جرمنی نے اسپین پر دباؤ ڈالا، تو فرانکو مشکل ہی سے راضی ہوگا، کیونکہ امریکہ اور برطانیہ کا اتحاد اسپین کی خارجہ پالیسی پر چھایا ہوا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ اگر لندن اور واشنگٹن محور کسی وقت قائم ہو گیا (جس کی ہر وقت توقع کی جاتی ہے) تو اسپین کے اغراض جو جنوبی امریکہ سے وابستہ ہیں خطرہ میں پڑ جائیں گے۔

ہرچند اسپین کے تعلقات، جنوبی امریکہ کی حکومتوں سے اس وقت تک خوشگوار ہیں، لیکن وہاں کی ہسپانی آبادیوں پر چونکہ روسی پر دباؤ کا اثر زیادہ ہو چکا ہے، اس لئے وہ فرانکو کے خلاف ہیں اور حال ہی میں بیونس آیرس کے انتخاب میں ۶۵۰۰۰ ووٹ اشتراکی جماعت نے حاصل کئے۔ لیکن اسپین کی نیشنلسٹ جماعت، ہسپانی امریکی جمہوریتوں میں فلانگسٹ تحریک کو کامیاب نہ بنا سکی۔ حال ہی میں کیوبا کی فلانگسٹ جماعت بھی نیشنل کی جا چکی ہے اور چلی میں بھی ان کی حالت اچھی نہیں۔ گنز کو میں انھوں نے بڑی کوششیں کیں، لیکن حسب مراد کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

ان حالات میں یہ کہنا کہ اسپین کی کس جماعت کو آخری فیصلہ کا اختیار حاصل ہوگا بہت مشکل ہے۔ بہ صورت موجودہ وہاں کی حکومت مختلف عناصر کا ایک مصنوعی امتزاج ہے اور ہرچند وہاں جنرل فرانکو کا اقتدار ابھی تک قائم ہے لیکن شاہ پسند جماعت برابر آگے بڑھتی جا رہی ہے اور شاہ الفانسو کی وفات پر جو عام مظاہرہ تعزیت کا کیا گیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ ”شاہ پسندی“ کا خیال وہاں قوی ہوتا جا رہا ہے۔

شہر کے علاوہ دیہات میں بھی یہ تحریک زور پکڑتی جا رہی ہے، کیونکہ کاشتکاروں کا خیال ہے کہ شہنشاہیت کے قیام سے ان کی حالت پھر درست ہو جائے گی اور وہ فلانگسٹ جماعت کے عذاب سے نجات پا جائیں گے۔

الغرض سیاسی جماعتوں کے لحاظ سے اسپین کی حالت اس وقت بہت خراب ہے اور نہیں کہا جاسکتا کہ ان میں کونسی جماعت اور کب، منظم حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوگی، لیکن وہاں کی اقتصادی حالت شاید اس کا انتظار نہیں کر سکتی اور بہت جلد ملک کو فیصلہ کرنا پڑے گا کہ اس کا نصب العین آئندہ کیا ہوگا۔

اس وقت اسپین کی حالت یہ ہے کہ ان لوگوں کے لئے جن کی غذا صرف روٹی ہے، روزانہ ایک پونڈ سے زیادہ نہیں مل سکتی اور گوشت تو دستیاب ہی نہیں ہوتا۔ یہی حال قریب قریب مچھلی کی گرائی کا ہے۔ کھتن کی نایابی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ ایک پونڈ مکھن کے لئے ۲۰ شلنگ ادا کرنا پڑتے ہیں اور دیہات میں تو یہ عالم ہے کہ شاید ہی کسی کو ایک وقت پیٹ بھر کھانے کو ملتا ہو۔

کھاد بیج اور مویشی کی وہاں بہت کمی ہے اور ذرائع نقل و حمل جو خانہ جنگی کے زمانہ میں خراب ہو گئے تھے، بدستور اسی حالت میں پائے جاتے ہیں اور پٹرول کی کمی نے ان ذرائع کو اور زیادہ بیکار بنا دیا ہے۔ یہی حال ریلوے کا ہے، کیونکہ انگلستان سے کوئلہ وہاں چاہ نہیں سکتا اور خود ان کے یہاں کوئلہ پیدا نہیں ہوتا۔

الغرض ان حالات میں اسپین کو بہت جلد فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ اس اقتصادی دباؤ کو کس طرح دور کر سکتا ہے، آیا جرمنی کا ساتھ دینے سے یا برطانیہ و امریکہ کی ہمدردیاں حاصل کرنے سے؟

جوش ملیح آبادی

جنگ عظیم کی ہولناک تباہ کاریوں کے بعد بدحواس دنیا نے جب ذرا ٹھہر کر امن کی سانس لی تو ہندوستان میں نئی پودہ کے بعض ادیبوں اور فن کاروں نے بھی زندگی کے مسائل کو ایک جدید نقطہ نظر سے دیکھنا شروع کیا۔ اس وقت تک ہماری اردو شاعری حقیقی دنیا سے الگ تھلگ، طلسم تخیل سے بنے ہوئے ایک سنہرے سنسار میں پڑی ایڑی رہی تھی۔ ہمارے ادب میں حیات کی تنقید تو خیر بڑی چیز ہے، زندگی کا ہو بہو عکس بھی تقریباً ناپید تھا۔ جن اخلاقی اور اقتصادی قدروں کے ستونوں پر سماج کی عمارت کھڑی ہوئی ہے، اُن کا کھوکھلا پن زندگی کے لئے ایک گھلی ہوئی دھکی بن چکا تھا۔ لیکن ہمارے شاعر اور ادیب ان تلخ حقیقتوں کی جانب سے آنکھیں بند کئے اپنے تخیل کی خود ساختہ فردوس میں مست تھے۔

حالی اردو کے پہلے شاعر تھے جنہوں نے زندگی کے درد کو شدت سے محسوس کر کے شاعری کے پُرانے سانچوں کو توڑنے اور ادب کو زندگی سے قریب لانے پر اصرار کیا۔ لیکن اپنی تمام مخلصانہ کوششوں کے باوجود حالی اس سے زیادہ اور کچھ نہ کر سکے کہ انہوں نے زمانہ کی مصلحتوں کے ساتھ ایک قسم کا عارضی سمجھوتہ کر لیا۔ ظاہر ہے کہ یہ سمجھوتہ اس زمانے کے حالات کے لحاظ سے کتنی ہی اہمیت کیوں نہ رکھتا ہو، مستقبل میں ہمارے دکھ درد کی دوا بر گز نہیں بن سکتا تھا۔

زندگی کے اس انتشاری دور میں اردو کے دو حساس شاعر، جنہوں نے کائنات کی شے پر ہاتھ رکھ کر زندگی کی بیماریوں کو بوجھنے کی کوشش کی جوش اور اقبال ہیں۔

یہ دونوں دردمند شاعر سماج کے موجودہ نظام سے بیزار ہیں اور دونوں مردِ جہ قدروں اور معیاروں کو سماج کے حق میں تھلک سمجھتے ہیں۔ لیکن جوش اور اقبال کا جادہ فکر بھی جدا جدا ہے اور منزل مقصود بھی الگ الگ۔ دونوں میں مماثلت صرف اس قدر ہے کہ دونوں شدت سے اس کو محسوس کرتے ہیں کہ زمانہ جو کچھ ہمیں دے رہا ہے، ملک و قوم کی ضرورتیں اور ہماری زندگی کے مطالبات اُس سے بہت آگے نکل آئے ہیں۔ دونوں انسانی قوتوں میں نامحدود امکانات کے قایل ہیں اور دونوں کی شاعری میں ایک ایسے عہدِ رزاس کی بشارت ہے جو ہماری موجودہ بے اطمینانیوں اور نا کامیوں کی کامل طور پر تلافی کر سکے گا۔

لیکن ان دونوں کا امتیازی فرق یہ ہے کہ جوش کی شاعری کی جڑیں واقعات اور زندگی کی اُس کشمکش میں پھیلی ہوئی ہیں جن سے ہم رات دن دوچار ہیں۔ اس کے برخلاف اقبال کی شاعری کی بنیادیں انڈیل زندگی کے چند ایسے بلند ترین اصولوں پر قائم ہیں جنہیں شاعر نے سختی کے ساتھ اپنی شاعری کا نصب العین قرار دے لیا ہے۔ اقبال فلسفی پہلے ہیں اور شاعر بعد کو جوش پہلے بھی شاعر ہیں اور بعد کو بھی شاعر ہیں۔ وہ اقبال کی طرح ہمیں ایک نچے مغز فلسفی کے روپ میں کہیں نظر نہیں آتے اس کے باوجود اُن کی شاعری میں تخیل، جذبات اور فکر کی جو دلکش ہم آہنگی پائی جاتی ہے وہ انہیں ایک اعلیٰ درجے کا

سنجیدہ خیال مفکر ثابت کرتی ہے۔

جوش کی شاعری میں ہمیں ”دل“ اور ”دماغ“ کا حیرت انگیز توازن ملتا ہے۔ یہی حسن توازن ہے جس نے انکی شاعری کو ان تمام بے اعتدالیوں سے بچا رکھا ہے جو کسی شاعر کے کلام میں جذبات یا فکر دونوں میں سے کسی ایک کا دباؤ بڑھ جانے سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسی اعتدال کی برکت سے جوش کی شاعری ایک چاق چوبند، تندرست، جیتی جاگتی، سنبھلی اور سنبھلی ہوئی شاعری ہے۔ جوش کی شاعری ایسے عبوری عہد کی پیداوار ہے جس میں زندگی ایک دو ماہیہ پر کھڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ اسی لئے ہمیں ان کی شاعری میں وہ تمام میلانات ملتے ہیں جو ہمیشہ عبوری عہد کے ادب کی امتیازی خصوصیات قرار دئے گئے ہیں۔ ایک پیہم جستجو کی غلش، حجابات کے ظاہری پردوں کو چیر کر اندر جھانکنے کی ایک ناقابل ضبط خواہش، واقعات اور حادثات کی تہ میں ڈوب کر حقائق کو سمجھنے کی ایک بے پایاں آرزو، زندگی کو جانچنے اور پرکھنے کی ایک مستقل تڑپ۔ ایک مسلسل انتشار و اضطراب، یہی وہ رجحانات ہیں جن سے جوش کی شاعری کی تشکیل ہوئی ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جوش کی شاعری، میتھیو آرملڈ کے اس مطالبے کو کہ ادب کو زندگی کی تنقید ہونا چاہئے، نہایت فراخ حوصلگی کے ساتھ پورا کرتی ہے۔

جوش کی شاعری کا عنصر اعظم ان کی شدید انقلاب پسندی ہے۔ جوش سماج کے ان تمام بتوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دینا چاہتے ہیں جن کے سامنے انسانیت سرنگوں نظر آتی ہے۔ وہ کھلے ہوئے الفاظ میں یقین دلاتے ہیں کہ ہمیں اپنے مقصد کے حصول کیلئے سب سے پہلے وہ تمام اخلاقی، مذہبی، اقتصادی اور سماجی قدیں مسموٰخ کرنا پڑیں گی جن کے تانے بانے پر ہماری زندگی کا موجودہ نظام قائم ہے۔ گویا دوسرے الفاظ میں جوش کی شاعری ”روح عصر“ کی پکار ہے جس میں ہمیں اپنے عہد کے تمام جدید میلانات کی جھنکار سنائی دیتی ہے۔

جوش کی سب سے بڑی خصوصیت جس نے ان کے کلام میں زندگی کی حقیقی روح پھونک دی ہے، ان کی شاعرانہ دیانت ہے۔ جوش کا باطن جلی حرفوں میں ان کی پیشانی پر لکھا رہتا ہے۔ صداقت اور خلوص ان کی شاعری کے سب سے زیادہ چمکتے ہوئے اوصاف ہیں۔

جوش کے اب ولہجہ کی شدید تلخی، جس کا رنگ ان کی تمام مصلحانہ شاعری پر چھایا ہوا ہے اسی شاعرانہ خلوص کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے۔ الفاظ کی کڑختگی اور کڑواہٹ اس المناک اور گہرے دکھ کا سراغ بتاتے ہیں جس میں شاعر کی روح مبتلا ہے۔ ملک و قوم کی بے حسی پر اس کا خون کھولنے لگتا ہے اور انسانوں کی بے حمیت، خود غرضی اور دنائت کا احساس کر کے کبھی کبھی اس پر غم و غصہ کی وجہ سے جنون کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ایسے موقعوں پر جوش کا چھتا ہوا طنز ایک تیز نشتر کی طرح سماج کی دکھتی ہوئی رگوں میں پیوست ہو جاتا ہے۔ اس لحاظ سے جوش اردو کے سب سے بڑے طنز نگار شاعر ہیں۔ ان کے پیشرو اکبر الہ آبادی بھی اس صنف کے ایک باکمال صنّاع تھے۔ لیکن اکبر خیالات کے لحاظ سے سخت قسم کے رجعت پسند واقع ہوئے تھے۔ وہ حال اور مستقبل دونوں کے رجحانات کی جانب سے آنکھیں بند کر کے ہمیں ماضی میں گھسیٹ لیجانا چاہتے تھے۔ اس کے برخلاف جوش کی یہ طنزیہ شاعری ماضی کی اہمیت کو نظر انداز کئے بغیر ایک طرف سماج کے کمزور پہلوؤں پر کاری ضرب لگاتی ہے اور دوسری طرف سنجیدگی کے ساتھ مستقل کے امکانات کا جائزہ لیتی ہے۔

جھکو جوش کی شاعری میں قنوطیت اور رجائیت کے عناصر پہلو پہلو نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری کا تجزیہ کرنے سے ہم اس نتیجے پر

پہونچتے ہیں کہ زندگی کے ان مسائل میں تو جن کا تعلق انسان کی مادی ضروریات اور اس کے مختلف پہلوؤں سے ہے جوش کا نقطہ نظر بڑی حد تک واضح، روشن اور رجائی ہے، لیکن اُن گتھیوں کے بارے میں جن کا تعلق فلسفہ زندگی سے ہے، جوش نہ صرف قنوطی بلکہ سخت قسم کے مشکوک ہیں۔ روح و مادہ، جبر و اختیار، خیر و شر، ان تمام پیچیدہ عقیدوں کے متعلق جوش کو فکر انسانی کی کامل نارسائی کا گھلا ہوا اعتراف ہے۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ انسان کی محدود عقل زندگی کے ان پراسرار حقائق کو سمجھنے سے قاصر ہے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اس نارسائی کی ذمہ داری کو بھی وہ اپنے مخصوص بے باکانہ انداز میں مشیت ہی کے سر تھوپتے ہیں اور انسان کو مجبور محض قرار دے کر اس کی تمام کوتاہیوں، غلط بینیوں اور لغزشوں کو ماحول اور وراثت کا لازمی نتیجہ قرار دیتے ہوئے اُسے ہر الزام سے صاف بچالے جاتے ہیں۔ جب جوش شاعرانہ انداز میں یہ کہتے ہیں:

تقدیر کے دائرے میں آنا ہی پڑا سراپے مشیت پہ جھکا نا ہی پڑا

واقع تھیں آل گل سے کلیاں لیکن پھوٹی جو کرن تو مسکرا نا ہی پڑا

تو فلسفے کی دیان میں اس سے اُن کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان کے اپنے اختیار میں نہ اس کا رونا ہے اور نہ اُس کا ہنسنا۔ ہمارا دکھ بھی غیر اختیاری ہے اور سکھ بھی۔ یہاں تک کہ ہمارا ارادہ بھی ہمارے قابو کی چیز نہیں۔ ارادے کا سرچشمہ ہماری اُن خواہشوں کے اندر سے پھوٹتا ہے جو ہمارے اختیار سے باہر ہیں۔ اس لئے ہم اپنے ارادے کو زیادہ سے زیادہ "اضطرار" کی ایک بدلی ہوئی صورت تصور کر سکتے ہیں۔

جبر و اختیار کے اس تصور کی روشنی میں جب ہم کمزور سیرت کے انسانوں کے ساتھ جوش کی سخت گیر یوں اور اُن کے غیظ و غضب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اُن کے "تفکر" اور اُن کے "جذبات" میں ایک قسم کا تضاد محسوس ہونے لگتا ہے۔ ہم سوچنے لگتے ہیں کہ اگر واقعی انسان "مجبور محض" ہے اور اس کے تمام اعمال و افکار کی باگ ڈور ایک جابر مشیت کے ہاتھ میں ہے تو پھر شاعر کو اس سختی کے ساتھ اُن سے محاسبہ کا کیا حق ہے۔ ہمیں تو غضبناک ہونے کے بجائے اُن سے شدید ہمدردی اور اُن کی کمزوریوں سے رواداری برتنا چاہئے۔ جوش کو بھی کبھی کبھی ان "بے بس" اور "مجبور" انسانوں پر ترس آتا ہے۔ لیکن نرمی کے ایسے لمبے کم آتے ہیں اور جوش کا زیادہ وقت اُن کا مضحکہ اڑانے اور انھیں سخت لہجے میں ڈانٹ پھٹکار کر دل کی بھڑاس نکالنے میں صرف ہوتا ہے، کہا جاسکتا ہے کہ جوش کی یہ تلخ نوائی اور سخت گیری اُن کی شاعری کا خُن بھی ہے اور عیب بھی۔

خدا اور مذہب کے متعلق جوش کا نقطہ نظر نہ تو جدید ہے اور نہ انوکھا، جوش سے پہلے بہت سے صاحب فکر مشککین ایسی ہی باتیں سوچ چکے ہیں۔ جوش اپنے مذہبی عقاید کے لحاظ سے جس جگہ اس وقت کھڑے ہوئے ہیں وہ قطعی انکار کا مقام ہرگز نہیں۔ انھیں خدا کے وجود کا پورا پورا احساس ہے۔ لیکن اُن کی فکر تذبذب اور تشکیک کے ایسے سخت بھنور میں پھنسی ہوئی ہے کہ وہ ایک مدت کے سوچ بچار کے بعد بھی اب تک اس فیصلہ پر نہیں پہنچ سکے ہیں کہ اُس عظیم الشان قوت کو جس کا نام خدا ہے کن اوصاف سے متصف کیا جائے۔

جوش کی منزل دراصل جستجو کی منزل ہے اور اُن کی یہ باطنی کشمکش، فکر اور جذبات کی دھوپ چھاؤں میں "عقل" اور "وجدان" کی جنگ ہے۔ زندگی کے المناک مصائب، جیون کا دکھ اور حیات کی بے معنی کشاکش کا جب وہ عقل کی خور دہین سے جایزہ لیتے ہیں تو اُن کے دماغ پر تشکیک کا ایک سخت دورہ پڑ جاتا ہے۔ لیکن جب وہ کائنات کے جلال و فروز مظاہر کا

وجدان کی روشنی میں مشاہدہ کرتے ہیں تو اُن کی روح پر یقین کی پھوار برسنے لگتی ہے اور وہ بے اختیار بول اُٹھتے ہیں:

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کے لئے اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

جوش کی محبت، گوشت اور پوست کی محبت ہے جس کا ادراک انھیں خالص جمالیاتی احساس کے ذریعہ نہیں بلکہ براہ راست حواس کی قوتوں کے ذریعہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے عشق کا رنگ تیز گہرا اور شوخ ہے۔ جوش کے یہاں جسمانی اور وجدانی حُسن پرستی کا ایک دلفریب امتزاج پایا جاتا ہے جسے انھوں نے اپنے شگفتہ تخیل کے سہارے رومانیت اور لطافت کی انتہائی بلند یوں پر پہنچا دیا ہے۔

منظرِ شاعری کے لحاظ سے جوش کا درجہ انیس اور نظیر اکبر آبادی کی صنایعوں کے باوجود اُردو شاعروں میں سب سے اونچا ہے۔ خصوصاً قدرتی مناظر کی مصوری میں جوش کی حُسن کاری کو دلکشی اور تنوع دونوں کے لحاظ سے کوئی دوسرا شاعر چھو بھی نہیں سکتا اُن کی منظر کشی نہ لو۔ انیس کی نقاشی کی طرح تا مثر تخیلی ہے اور نہ نظیر اکبر آبادی کی مصوری کے مانند سرتاسر خارجی۔ مناظر قدرت کے متعلق جوش کا مشاہدہ ذاتی اور براہ راست ہے اور یہی سبب ہے کہ اُن کی منظرِ شاعری اپنے داخلی رنگ کے باوجود خلوص، اصلیت اور تروتازگی سے معمور ہے۔

جوش ہندوستان کی متحدہ قومیت اور انسانوں کی عالمگیر برادری کا خواب دیکھتے ہیں۔ لیکن اُن کا دعویٰ ہے کہ سوسائٹی کا موجود نظام بدلے بغیر اس خواب کی تعبیر محال ہے۔ اُن کا ایمان ہے کہ سماج کی بوسیدہ عمارت کی مرمت کر کے اسے گرنے سے بچانے کی کوشش ایک سنگین تاریخی حماقت ہوگی۔ اس عمارت کو ایک سرے سے گرا دینا چاہئے۔ بلکہ تنہا عمارت کو ڈھا دینے ہی سے کام نہیں چلے گا، اس نیو کو بھی کھود کر پھینک دینا چاہئے جس پر اس عمارت کے سقف و ستون قائم ہیں۔

جب ”شباب“ جس کے ساتھ جوش نے مستقبل کی تمام امیدیں قائم کر رکھی ہیں، ”قدامت“ کو لٹا کر چیلنج دیتا ہے:-

ہٹ۔ کہ اب سچی عمل کی راہ میں آتا ہوں میں خلق واقع ہے کہ جب آتا ہوں، چھا جاتا ہوں میں

اے قدامت۔ یہ کھلی ہے سامنے راہِ فرار بھاگ وہ آیا نئی تہذیب کا پرور و گار

تو جوش مریدانہ انداز میں شباب کی پیٹھ ٹھونک ٹھونک کر اس کا حوصلہ یوں بڑھاتے ہیں:

گئے وہ دن۔ کہ تو زنداں میں جب آنسو بہاتا تھا ضرورت ہے قفس پر اب تجھے بجلی گرانے کی

گئے وہ دن کہ تو محرومی قسمت پر روتا تھا ضرورت ہے تجھے اب آفتوں پر مسکرانے کی

تڑپ، پیہم تڑپ، اتنا تڑپ برق تپاں بن جا

خدا اے زمین بے حقیقت! آسماں بن جا

غرض کہ جوش کی شاعری ماضی کا تبصرہ، حال کی تنقید اور مستقبل کی بشارت ہے۔ اُن کے اشعار پڑھ کر دلوں میں تازگی اور ہمت میں توانائی آ جاتی ہے۔ روح میں پیکار عمل کی آرزوئیں بے چین ہو جاتی ہیں۔ دل کی گہرائیوں سے ایک نغمہ بلند ہوتا ہے جس کے سروں میں مستقبل کے سہانے خواب لپٹے ہوئے نظر آتے ہیں اور ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے ”امید“ کی حسین دیوی زونگی کے رباب پر محبت اور آزادی کے ترانے گنگنا رہی ہے۔

مسعود علی ذوقی

(منشور لاسکی)

مکتوبات نیاز

صدیقی - ۵۸ جون کا گرامی نامہ کل ۸ اگست کو ملا۔ آپ نے دیکھا آپ مجھ سے کتنی دور ہیں! یعنی اس دور برق و کبریا میں بھی پورے دو مہینے دور! اگر ہم آپ دو مختلف کڑوں میں ہوتے تو یہ فاصلہ اربوں میل میں ظاہر کیا جاتا۔ آپ ابھی جوان ہیں اس لئے یہ سُکر شاید نہیں گے، لیکن مجھے تو اس خیال سے احتلاج ہونے لگتا ہے۔ آپ نے یہ لکھ کر کہ ”میری واپسی کا کچھ ٹھیک نہیں“ اور زیادہ مایوس کر دیا۔ بار بار تمیر کا یہ شعر یاد آ رہا ہے:

تیرے ایفاء عہد تک نہ جنے

عمر نے ہم سے بیوفائی کی

جنگ کا زمانہ ہے، ہندوستان میں رہتا ہوں، ملاحظات میں کیا رکھا ہے کہ انہیں علیحدہ کر کے آپ کو پرچہ بھیجوں۔ رسالہ گم ہونے کی وجہ اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ درمیان میں بیس جگہ احتساب و مراقبہ ہوتا ہے اور معلوم نہیں کس جگہ وہ پرزے پرزے ہو کر اس قابل نہیں رہتا کہ آگے بڑھایا جاسکے۔ مارچ و اپریل کے پرچے پھر بھیج رہا ہوں، لیکن ان کے پہنچنے یا نہ پہنچنے کی اطلاع بھی غالباً چار مہینے کے بعد آئے گی۔ معاذ اللہ! اس دوران میں آپ کے پاس جتنے عربی رسائل جمع ہو گئے ہوں وہ سب یا ان میں سے خاص خاص بھیج دیئے، کتابوں کی ضرورت نہیں۔

حضرت،

عتاب نامہ پہنچا۔ جواب تو خیر پھر دوں گا، لیکن فی الحال مجھے اس کا لطف اٹھانے دیجئے کہ کتنی کوشش کے بعد میں آپ کو برہم کر سکا ہوں! معاملہ ”جواب تلخ“ اور ”لب لعل شکر خا“ کا نہیں، بلکہ صرف یہ کہ میں بھی اس برہمی پر نہیں ہنس کر آپ کی بے اعتنائیوں کا انتقام لے سکوں گا اور اب آپ کو پتہ چلے گا کہ غصہ کا جواب قہقہہ سے دینا کتنی خون کھولا دینے والی چیز ہے!

اچھا۔ تو آپ خفا ہیں!۔ کیوں؟ اس لئے کہ میں آپ کو فریب میں مبتلا رکھنے کے لئے جھوٹ نہیں بولا۔ یا اس لئے کہ آپ اس سے زیادہ سچ بولنے پر قادر نہ تھے؟۔ بہر حال وجہ جو بھی ہو۔ واقعہ دراصل بہت سخت ہو اور ”جان“ عزیز ہو یا نہ ہو، لیکن اب تو اُس سے ہاتھ دھونا ہی پڑے گا۔ پھر۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اسکے لئے بہتر صورت آپ نے کیا سوچی ہے؟۔ سنکھیا؟۔ افیون؟۔ ریل کی پٹری یا بجلی کا تار؟۔ میں ممنون ہوں گا اگر آپ قبل سے مجھے مطلع فرما دیں گے، تاکہ میں آپ سے رخصت ہونے کے لئے بروقت دہاں پہنچ جاؤں

سنئے جناب،

زندگی گزرتی یا نہ گزرتی، سوال یہ ہے کہ کس کارگزر یاد ہی کیوں آئے؟ میں نے آپ کو خط اس لئے نہیں بھیجا تھا کہ آپ میری سفارش کر کے ”سیاستِ درباں“ کے عذاب سے مجھے نجات دلوائیں، بلکہ صرف اس لئے کہ آپ میری مردانگی کی داد دیں۔

معلوم ہوتا ہے آپ خود ہی نہیں چاہتے کہ اب میں زندہ رہوں۔ بہتر ہے، اگر مرضی یہی ہے تو اُن سے کہہ دیجئے جو آپ کا جی چاہے، لیکن یہ سمجھا دیجئے کہ اب اس ”عشوہ ناروا“ کی تاب مجھ میں نہیں ہے۔

رفتم زکوئے یار اینک

در دامن ماست حاصل ما!

ماشاء اللہ، کیا کہنا!

دُنیا ادھر کی ادھر ہو گئی اور آپ ابھی تک یہی سمجھ رہے ہیں کہ سورج ڈھلا بھی نہیں! حضرت،

دیرست کزیں قافلہ بردند جرس را

کیا بتاؤں، دل کی ویرانی کا کیا عالم ہے — ”جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر گزرا“ آپ اس کے جواب میں صبر کی تلقین نہ کیجئے گا، وہ پہلے ہی آچکا ہے اور اب تکلیف یہی ہے کہ وہ کیوں آیا؟ حیرت تو خیر ہونا ہی تھی!

میں جب کبھی آپ کو خط لکھتا ہوں تو دیر تک سوچتا رہتا ہوں کہ آپ سے خطاب کس طرح کروں — آپ تو ”محترم“ لکھ کر اس فرض سے بہ آسانی سبکدوش ہو جاتی ہیں — تصنع و تکلف ہی ٹھیرانا؟ — لیکن میں اس کے جواب میں آپ کو ”محترمہ“ لکھنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ ”احترام“ کی حد زیادہ سے زیادہ ”حریم کعبہ“ تک ہے اور میں آپ کو اُس وقت کی چیز سمجھتا ہوں، جب کعبہ، کعبہ نہ تھا، بلکہ ”شہدہ“ تھا!

خیر، فی الحال اس کو چھوڑئے، لیکن سوچکر مجھے بتائیے ضرور کہ میں آپ کو کیا لکھا کروں — یعنی جو سوچتا ہوں وہی لکھوں یا کچھ اور؟

ہاں، مجھے یاد ہے اور اچھی طرح یاد ہے کہ اب سے دو سال پہلے آپ کس تھیں، لیکن اس سے متفق نہیں کہ اب آپ کچھ اور ہو گئی ہیں۔ دیکھئے عورت کی زندگی میں بڑی چیز صرف اُس کا احساس ہے — مرد کو تو خیر ہمیشہ احساس سے جنگ کرنا پڑتی ہے، اور شاید زیادہ تر عورت ہی کے لئے — اور اسی کو حد سے نہ گزرنے دینا اس کی کامیابی ہے۔

حالات کے لحاظ سے احساس میں تغیر پیدا ہونا لازم ہے، اس لئے اگر آپ یہ چاہتی ہیں کہ شادی ہو جانے کے بعد بھی آپ عہدِ دوشیزگی کی ”زنگین دنیا“ میں زندگی بسر کرتی رہیں تو یہ آپ کا ظلم ہے — خود اپنے اوپر! ماضی کی یاد سے لطف اٹھانا بُرا نہیں، لیکن اس یاد سے حال و مستقبل تباہ کرنا حماقت ہے — بیشک بہت سی غلات توقع باتیں آپ کے سامنے آ رہی ہوں گی، لیکن اتنے دنوں تک آپ نے پھولوں کی سیج پر راتیں گزاری ہیں

اب کچھ لطف خار زار کا بھی اٹھائے، اور اگر آپ نے اسے گوارا کر لیا تو پھر کانٹوں پر بھی نیند آنے لگیگی !
مجھے یقیناً آپ کے ساتھ ہمدردی ہے، لیکن کوشش کیا کر سکتا ہوں جب کہ اس کی نوعیت بالکل ایسی ہی ہوگی
جیسے کوئی شخص سورج سے صرف اس کی روشنی لیکر حرارت کو واپس کر دینا چاہے !
جن سے آپ کی قسمت وابستہ ہے، اُن کو میں نے دیکھا تو نہیں، لیکن یہ جانتا ہوں کہ کوئی انسان آپ کو بچپن
کر کے خود بھی عرصہ تک چین سے نہیں بیٹھ سکتا، اس لئے آپ رواداری سے کام لے جائیے، وہ کب تک اپنی غلطی کو محسوس
نہ کریں گے۔

آپ آئندہ کوئی خط مجھے اُن کو دکھائے بغیر نہ بھیجئے، ورنہ ممکن ہے، اس سے گفتھیوں میں اور اضافہ ہو جائے۔

آپ نے دیکھی اپنے دوست کی حاقق ! میں نہ کہتا تھا کہ ۶ فٹ کے آدمی سے کبھی عقل کی توقع نہ رکھیے اور
وہی ہوا۔ کل دوپہر کو وہ میرے پاس تشریف لائے، میں نے اُن سے کہا کہ یہ وقت مناسب نہیں ہے۔ آج شام یا
کل صبح میں خود چل کر ملا دوں گا۔ مجھ سے تو کچھ نہیں کہا، لیکن میرے مکان سے اٹھ کر سیدھے وہیں چلے گئے۔
مجھے نہیں معلوم کہ کیا باتیں ہوئیں، لیکن آج صبح جب میں وہاں گیا، تو دیکھا کہ تیور بہت خراب تھے۔ پہلے خاموشی
طاری رہی اور پھر عتاب شروع ہوا۔ اُن کی حاقق کی وجہ سے مجھ پر !
ذرا پوچھئے تو سہی، کیا کہ گئے ہیں ؟ کوئی قسمہ باقی لگا رکھا یا نہیں ؟

گلشن صحافت میں ایک غنی نو کا اضافہ

”شباب“

ادب اور دو کا ایک ترقی پسند ماہنامہ

ملک کے مشاہیر اہل قلم حضرات کے بلند پایہ مقالے ترقی یافتہ
ادب کے اعلیٰ مضامین۔ دلچسپ مختاری افسانے۔ اعلیٰ نفسیاتی
ڈرامے۔ تاریخی شہ پارے۔ روح نواز پرکیٹ غزلیں۔ وجد آور
سرمدی نظمیں۔ دلاؤیز پیارے پیارے گیت، ماہ باہ اپنی تمام
رعنائیوں، دلفریبیوں اور مصنوعی خوبیوں کے مطلع صحافت پر
عنقریب جلوہ گر ہوگا۔ نمونہ کا پرچہ بالکل مفت روانہ ہوگا۔

فوراً اپنے اسم گرامی اور مکمل پتہ سے مطلع کریں۔
منجرا: شباب پوسٹ بکس نمبر ۱۲۶/۳ ممبئی ۳

آنکھ کے جملہ امراض کا شرطیہ علاج

صرف ایک ڈبہ میں

یہ کاجل کی ڈبہ ہے جو ایک سال کے لئے کافی ہے۔ اسکے
روزانہ استعمال سے ایک مہینے کے اندر آپ کی آنکھیں
ایسی نکھر جائیں گی گویا کبھی کوئی شکایت پیدا ہی نہ ہوئی
تھی۔ یہ کاجل متعدد جڑی بوٹیوں سے طیار کیا جاتا ہے
اور ہزاروں آدمیوں کو فائدہ پہونچا چکا ہے۔

قیمت فی ڈبہ مع محصول دور و پہ چار آنہ

عم۔ سلیم۔ ذریعہ دفتر نگار لکھنؤ

مطبوعات موصولہ

کلیات میر تقی میر | نو لکھنؤ پریس لکھنؤ نے بڑے اہتمام کے ساتھ اس کلیات کو شائع کیا ہے۔ شروع میں جناب عبدالباری صاحب آتشی (مرتب کلیات) کا بسیط مقدمہ ہے، جس میں میر کے متعلق ہم کو بعض نئے حالات و واقعات بھی نظر آتے ہیں۔

یہ کلیات مختلف نسخوں کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ایک صحیح نسخہ پبلک کے سامنے پیش کیا جائے۔ اخیر میں بہت سے ایسے الفاظ کی فرہنگ بھی دیدی گئی ہے جو مشکل یا نادر استعمال ہیں۔ کتابت و طباعت بھی پاکیزہ ہے اور کاغذ بھی دبیز۔ کلیات مجلد شائع کیا گیا ہے اور اس کی قیمت پانچ روپیہ ہے جو اس زمانہ میں ایک ہزار سے زیادہ صفحات کی کتاب کے لئے کسی طرح زائد نہیں۔ افسوس ہے کہ باوجود احتیاط کے کتابت کی غلطیاں اب بھی کافی نظر آتی ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ اس میں ایک صحت نامہ شامل کر دیا جائے۔

کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ | دکن کے بادشاہوں اور خصوصیت کے ساتھ قطب شاہیوں میں محمد قلی قطب شاہ کو خاص مرکزی حیثیت حاصل ہے، اسی بادشاہ نے حیدر آباد کی بنیاد ڈالی اور حیدر آباد کی مشہور عمارت چارمینار اسی کی یادگار ہے۔

اس کا عہد امن و سکون، فراغ و اطمینان اور ذہنی ترقیوں کے لحاظ سے بھی مشہور ہے اور ان ترقیوں کے لحاظ سے بھی جو ایک تمدن کی انتہائی عروج کے وقت ہر ملک میں پائی جاتی ہیں۔ یہ بادشاہ بڑا رنگین مزاج تھا اور اس کی زندگی حسن و عشق کا نہایت دلنریب مرقع تھی۔ یہ شاعر بھی تھا اور اتنا بڑا شاعر کہ شاید ہی کوئی اور فرمانروا اس کا مثل نظر آئے۔

دلی اور بنگ آبادی، اردو شاعری کا ابوالآبار سمجھا جاتا ہے، لیکن اب محمد قلی قطب شاہ کا کلیات دستیاب ہو جانے کے بعد ثابت ہوا کہ دلی سے کسی سو برس پہلے اردو زبان نے اتنی ترقی کر لی تھی کہ اس میں نظم و نثر کا کافی ذخیرہ فراہم ہو گیا تھا۔ حیدر آباد کی "مجلس اشاعت دکنی مخطوطات" نے نواب سالار جنگ بہادر کی سرپرستی میں کچھ عرصے دکن کے قدیم اردو لٹریچر کو پیش کرنے کی کوشش شروع کی ہے اور اس سلسلہ میں وہ متعدد چیزیں پیش کر چکی ہے۔ کلیات محمد قلی قطب شاہ اسی سلسلہ کی چیز ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ڈاکٹر قادری زور نے اسے جس اہتمام اور تحقیق و کاوش کے بعد شائع کیا ہے اس کی مثال ہم کو اس دور میں کم نظر آتی ہے اس کلیات میں علاوہ حالات محمد قلی قطب شاہ کے اس کے ہر قسم کا کلام بھی نظر آتا ہے اور تصاویر و نقوش سے مزین کردہ اس کے حسن میں اور اضافہ کر دیا گیا ہے ابتدا میں ایک بسیط مقدمہ بھی نظر آتا ہے

جس میں کلام پر تفصیلی تبصرہ کیا گیا ہے اور ہر شعر کے نیچے بین السطور میں تمام قدیم الفاظ کے معنی بھی درج کر دیے گئے ہیں۔
 یہ کلیات آرٹس پیر پر مجلد شائع کیا گیا ہے اور موجودہ زمانہ میں جبکہ کاغذ کی گرانی اتہا کو پہونچ چکی ہے اس اہتمام کے ساتھ اتنی بڑی کتاب کا شائع کرنا ترویج ادب کے شوق کی انتہائی دلیل ہے۔

قیمت پندرہ روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ: سب رس کتاب گھر - حیدر آباد دکن۔

یہ کتاب بھی دکنی مخطوطات کی مجلس اشاعت نے شائع کی ہے اور اس کے مرتب عبدالقادر سرور سی ام۔ اسے ہیں۔

کلیات سراج

سراج اورنگ آبادی، (دلی کے بعد) دکن کا سب سے زیادہ مشہور شاعر ہوا ہے، اس کا زمانہ وہی تھا جو میر کا اور ہر چندان دونوں میں بعد مکانی کافی پایا جاتا ہے، لیکن ذہنی بعد مطلق نظر نہیں آتا۔ سب سے پہلے سراج کا ذکر میر نے اپنے تذکرہ میں کیا اور اس کی "مربوط گوئی" کی داد دی، اس کے بعد دوسرے تذکروں میں بھی اس کو نقل کیا گیا، لیکن سراج کے کلام کا کوئی ایسا مجموعہ سامنے نہ تھا جس کے مطالعہ کے بعد زیادہ صحیح رائے قائم کی جاتی۔

اب اس کلیات کی اشاعت نے سراج کو ہم سے قریب تر کر دیا ہے اور اس کے مطالعہ کے بعد ہم یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ سراج اپنے ذوق کے لحاظ سے کسی طرح دلی اور میر سے کم نہ تھا۔

اس مجموعہ میں قصاید، ثنویاں، غزلیں، رباعیاں، مستزاد مخمس اور فارسی خطوط و غزلیات سبھی کچھ پایا جاتا ہے اور یہ دیکھ کر کتنی حیرت ہوتی ہے کہ اب سے ڈھائی سو سال قبل اورنگ آباد کا یہ شاعر کتنی صاف زبان میں کتنی اچھی شاعری کرتا تھا۔
 ابتدا میں ایک بسیط مقدمہ کے ذریعہ سے سراج کے حالات بھی پیش کئے گئے ہیں اور اس کی شاعری پر تفصیلی تبصرہ بھی کیا گیا ہے جو بجائے خود بڑے کام کی چیز ہے، طباعت، کتابت اور کاغذ ہر لحاظ سے نہایت اعلیٰ پایہ پر اس کلیات کی اشاعت کی گئی ہے۔ قیمت پانچ روپیہ ملنے کا پتہ: سب رس کتاب گھر - حیدر آباد دکن۔

مولوی مہیش پرشاد پروفیسر ہندو یونیورسٹی بنارس، عرصہ سے غالب کو اپنا موضوع تفتیش بنائے ہوئے ہیں اور یہ کتاب اسی تحقیق و جستجو کا نتیجہ ہے۔

خطوط غالب (پہلی جلد)

خطوط غالب کے تین مجموعے اس وقت تک شائع ہو چکے ہیں ایک عود ہندی۔ دوسرا اردوئے معلّے اور تیسرا مکاتیب غالب (جو صرف رامپور سے متعلق ہیں) اس مجموعہ میں علاوہ اردوئے معلّے اور عود ہندی کے بعض خطوط ایسے بھی ہیں جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے اور ایسے بھی جو کبھی شائع ہی نہیں ہوئے۔

فاضل مرتب نے اس مجموعہ میں دو باتوں کا خاص خیال رکھا ہے ایک یہ کہ اس سے قبل کے شائع شدہ خطوط میں جو غلطیاں تھیں ان کو دور کیا گیا ہے اور دوسری بڑی بات یہ کہ مکاتیب کو تاریخی ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا غالباً غلط ہو گا کہ اس وقت "خطوط غالب" کا سب سے زیادہ موثق و منظم نسخہ یہی ہے اور نہ صرف شیدائیان غالب بلکہ نقادان ادب کے لئے بھی بڑے کام کی چیز ہے۔

اس کتاب کی نظر ثانی اور طباعت کی نگرانی پروفیسر عبدالستار صاحب صدیقی نے کی ہے، جو نہایت ہی سخت قسم کے نقاد ہیں اور اس لئے صحت و اطلاق کے لحاظ سے بھی اس مجموعہ کی قیمت بہت بڑھ جاتی ہے۔

کتاب ٹائپ میں چھاپی گئی ہے اس لئے بہت صاف و نفیس ہے۔ اس کی قیمت للچر ہے اور ملنے کا پتہ:
ہندوستانی اکاڈمی - الہ آباد

ترتیب نزول قرآن کریم مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ کا مرکز قرآن کریم ہے اور تاریخ اسلام کا کوئی دور ایسا نہیں گزرا جس کا پس منظر کلام اللہ نہ رہا ہو اس لئے جماعت اسلامی سے متعلق کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کا مطالعہ بغیر مطالعہ قرآن کے مکمل ہو سکے۔ لیکن تاریخی نقطہ نظر سے مطالعہ قرآن کا سب سے زیادہ مشکل پہلو اسکی تاریخ نزول و ترتیب ہے۔

اس باب میں محدثین، موزنین اور مفسرین کا ہمیشہ اختلاف رہا ہے اور یہ مسئلہ اتنا پیچیدہ ہے کہ خود مسلمان بھی اب تک اس کو حل نہیں کر سکے دوسروں کا کیا ذکر ہے۔

قرآن مجید کی آیتوں کی ترتیب نزول اگرچہ ہی طرح معلوم ہو جائے تو قرآن کے سمجھنے میں بھی آسانی پیدا ہو سکتی ہے اور بہت سے دوسرے اختلافات بھی دور ہو سکتے ہیں۔

اس اہم مسئلہ پر پہلے بھی لوگوں نے کوشش کی ہے، لیکن پروفیسر محمد اجل خاں صاحب کی یہ سعی غالباً سب سے جدا اور زیادہ کامیاب ہے۔ انھوں نے اس وقت کے تمام مذہبی اور انتقادی لٹریچر کو سامنے رکھ کر کئی سال کی تحقیق و جستجو کے بعد یہ کتاب مرتب کی ہے اور کافی وثوق کے ساتھ، ۱۱ رمضان ۱۳۷۱ھ سے ۱۳۷۲ھ تک نزول قرآن کی تاریخی ترتیب پیش کر دی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ نقشہ میں انھوں نے اور بھی بہت سی مفید معلومات فراہم کر دی ہیں جن سے اصل مسئلہ کے سمجھنے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔ یہ نسخہ پانچ روپیہ میں کتاب گھر، ممبئی کے گڑھا الہ آباد سے مل سکتا ہے۔

ساز و آہنگ جناب سیما ب اکبر آبادی کا تازہ ترین مجموعہ کلام ہے جو نہایت اہتمام کے ساتھ مجلد شائع ہوا ہے۔ اس مجموعہ میں ۴۹ نظمیں ہیں اور پانچ ابواب میں تقسیم کی گئی ہیں۔ پہلے باب میں، ”قومیت، سیاست اور وطنیت“ سے تعلق رکھنے والی نظمیں درج کی گئی ہیں اور دوسرے باب میں ”مذہب، اخلاق و معاشرت“ سے تعلق رکھنے والی۔ تیسرے باب منظومات ”شعر و حکم“ کے لئے وقف ہے، چوتھے ”معتقدات“ کے لئے۔ پانچویں میں بچوں سے خطاب کیا گیا ہے۔ جناب سیما ب ملک کے مشہور شاعر ہیں اور لوگ ان کے رنگ سخن سے اس قدر واقف ہیں کہ اس کے متعلق زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ اس مجموعہ کی قیمت دو روپیہ آٹھ آنے ہے اور ملنے کا پتہ قصر الادب آگرہ۔

کمال ترجمہ ہے بنگالی زبان کے مشہور ناول ”بارداری“ کا جسے بنگال کے بارہ ادیبوں نے قلم بند کیا تھا۔ ترجمہ راجہ ہدی علی خاں نے کیا ہے جو اس ترجمہ کا خاص سلیقہ رکھتے ہیں اور جو خود بھی اچھے ادیب و فنانہ نگار ہیں۔ ترجمہ بہت صاف و سلیس ہے اور مطلق یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کسی دوسری زبان کا ہے۔ اس کا پلاٹ ویسا ہی ہے جیسا عام طور پر بنگالی ناولوں کا ہوتا ہے اور جن میں روز کی زندگی سے بحث کی جاتی ہے۔

اس کو نرائین دت سہگل اینڈ سنز تاجران گتھ لاہور نے شائع کیا ہے اور قیمت ہے۔
دنیا کے آرزو تین افسانوں کا مجموعہ ہے جو ڈائری کی صورت سے پیش کئے گئے ہیں۔ ان کا موضوع ملک کی اقتصادی و معاشی دشواریوں کو پیش کرنا ہے، اس کتاب کو ”بیکار نوجوانوں کی انقلابی روجوں“ کے نام منسوب

کیا گیا ہے اور فسانوں کے پلاٹ کے لحاظ سے یہ انتساب بالکل درست ہے۔

میرزا ادیب ان فسانوں کے مصنف ہیں اور اس میں شک نہیں کہ انھوں نے ہمارے بیکار نوجوانوں کی زندگی کو بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ قیمت پندرہ روپے اور طے کتبہ: نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لاہور۔

سجاد علی انصاری مرحوم کے مجموعہ مقالات و منظومات کا دوسرا اڈیشن ہے، لیکن چونکہ اس میں ان کا ایک طویل ڈراما **محشر خیال** "روز جزا" بھی شامل کر دیا گیا ہے اس لئے یہ چیز پچھلے اڈیشن سے بالکل مختلف ہو گئی ہے۔

سجاد علی مرحوم علیگڑھ یونیورسٹی کے اُس عہد کی پیداوار تھے جب وہاں زندگی و نشاط دونوں مترادف الفاظ سمجھے جاتے تھے۔ ہر چند ان کی عمر نے زیادہ وفات کی، لیکن اپنے عنفوان شباب ہی میں انھوں نے جو کچھ ادبی سرمایہ چھوڑا وہ ان کے قبل از وقت پختہ ہو جانے کی کافی شہادت ہے۔ ان کے انداز بیان میں ایک خاص قسم کا فلسفیانہ استدلال ہر جگہ نظر آتا ہے اور آسکر وائلڈ کے رنگ کی جھلک پوری طرح نمایاں ہے وہ بڑے "خوش باش" انسان تھے اور یہی کیفیت ان کے مقالات سے بھی ظاہر ہے۔ ان کے غزلوں سے بھی اُن کے پاکیزہ مذاق کا پتہ چلتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اگر سجاد اپنی عمر طبعی تک پہنچتے تو نثر و نظم دونوں میں انکا شمار ملک کے بہترین انشا پردازوں میں کیا جاتا۔

اس کتاب کی قیمت دو روپیہ ہے اور جناب غلام الیاس احمد مجیبی قریول باغ نئی دہلی سے مل سکتی ہے۔

سید علی عباس عباس لکچر ڈویژن سہارنپور کے اردو و فارسی کلام کا مجموعہ ہے۔ جسے انجمن ترقی ادب دہلی نے شائع کیا ہے۔ کلیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ غالب سے بہت متاثر ہیں، لیکن تقلید غالب میں آپ جادہ اعتدال سے منحرف نہیں ہوئے۔ آپ کا کلام بتاتا ہے کہ یہ ایک پڑھے لکھے انسان کا کلام ہے اور تلاش سے بعض ایسے اشعار بھی مل سکتے ہیں جن کو ہم جان "تغزل" کہہ سکتے ہیں۔ قیمت ایک روپیہ ہے۔

جناب خواجہ عزیز الحسن صاحب غوری مجذوب بی۔ اے نے، محکمہ توسیع تعلیم یو پی کی فرمائش پر نظمیں کا ایک انتخاب اس نام سے مرتب کیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ انتخاب بہت پاکیزہ ہے **پھولوں کی ڈالی** اس انتخاب میں ہندوستان کے تمام بہت سے نئے پُرانے شعراء کو جگہ دی گئی ہے اور اُن کا وہی کلام پیش کیا گیا ہے جو واقعی اچھا ہے۔ اس میں حمد و نعت، اخلاق، درس عمل، درس عبرت، نصائح، حب وطن، محبت، مناظر قدرت اور ظرافت وغیرہ عنوانات قائم کر کے نظموں کا انتخاب کیا گیا ہے اور اگر نظموں کا مطالعہ بھی تربیت اطفال میں کام دے سکتا ہے تو اس مجموعہ سے یہ کام اچھی طرح لیا جاسکتا ہے۔ یہ مجموعہ صدیق بگ ڈپو سے دو روپیہ میں مل سکتا ہے۔

جناب ساغر نظامی نے جو ان کا ایشیا اس نام سے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ اس میں **روح مکاتیب حصہ اول** سے لیکر ۱۹۷۱ء تک مشاہیر ملک کے وہ تمام خطوط شامل ہیں جو ساغر صاحب کو موصول ہوئے۔

اس حصہ میں ۱۱ حضرات کے نام نظر آتے ہیں۔ جن میں سے اکثر مشہور ادیب ہیں۔ یہ خدمت یقیناً قابل قدر ہے اور امید ہے کہ ملک اس کا اعتراف کرے گا۔

اس کی قیمت پندرہ روپے اور طے کتبہ ادبی مرکز میرٹھ

میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں | عرصہ ہوا ڈیڑھ ننگ خیال نے ملک کے بعض مشہور افسانہ نگاروں سے یہ سوال کیا تھا کہ وہ فسانہ کیونکر لکھتے ہیں اور اس کا جواب ننگ خیال میں شائع ہوا تھا۔ اب ان تمام جوابات کو کچھ کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے۔

قیمت ایک روپیہ اور پلٹنے کا پتہ :- دارالادب پنجاب بارود خانہ اسٹریٹ لاہور۔

شہر خموشاں | سید محمود مورخ بی۔ اے کے افسانوں کا مجموعہ ہے، مورخ صاحب بڑے پُرانے صحافی اور انشاپرور ہیں اس مجموعہ کے افسانے مختلف رسائل میں شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ ان افسانوں کا موضوع سائنٹفک ہے اور

اس لئے وہ نہ صرف دلچسپ بلکہ مفید بھی ہیں۔ قیمت ایک روپیہ اور پلٹنے کا پتہ :- گل فروش پبلشنگ ہاؤس، دہلی

ذکر و فکر | جناب مقصود زاهدی کے چند افسانوں کا مجموعہ ہے جن میں زندگی کے اُن تلخ تجربات کو پیش کیا گیا ہے جن سے آجکل ہر نوجوان دوچار نظر آتا ہے۔ جناب مقصود نے جس قوت مشاہدہ و تجزیہ نگاری سے کام لیا ہے، اس سے اس

نوجوان افسانہ نگار کا ادبی مستقبل کے متعلق اچھی امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ قیمت ۸ روپے کا پتہ :- مکتبہ مسافر، ادبی مرکز میرٹھ

ہفت اورنگ حصہ اول | جناب اقبال حسین انصاری بی۔ اے کی تصنیف ہے۔ جناب اقبال فارسی کے اسکالر ہیں اور اب ام۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے خان آرز پر ریسرچ کر رہے ہیں۔

بی۔ اے آنرز کی طیاری کے سلسلہ میں انھوں نے فارسی لٹریچر پر متعدد مقالات فارسی میں لکھے، لیکن ان کے شائع ہونے کی نوبت نہ آسکی۔ اب آپ ان کا اردو ترجمہ بالاقساط شائع کرنا چاہتے ہیں اور یہ پہلی قسط ہے۔

اس میں فردوسی، نظامی عروضی، لسان الغیب اور حمزہ پر اظہار خیال کیا گیا ہے اور ساتھ ہی زردشت، ایرانی ادب اور صوفیانہ لٹریچر پر بھی کافی روشنی ڈالی ہے

وہ حضرات جو فارسی کا ذوق رکھتے ہیں ان کے لئے یہ رسالہ بہت کام کی چیز ہے۔ امید ہے کہ جناب اقبال اپنے باقی مقالات بھی شائع کرنے کی جلد کوشش کریں گے۔

قیمت عہدہ ہے اور پلٹنے کا پتہ :- ابو محمد انصاری محلہ سپاہ، جوہنور۔

نقش اول | صاحبہ عابد حسین (اہلیہ ڈاکٹر عابد حسین صاحب) کے چند ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ زبان، بیان اور خیال سب میں نشین سادگی پائی جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مصنفہ نے جو کچھ لکھا ہے موجودہ معاشرت کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد لکھا ہے۔ کتاب کافی اہتمام کے ساتھ مجلد شائع کی گئی ہے۔

پلٹنے کا پتہ :- عالمی پبلشنگ ہاؤس دہلی اور قیمت دو روپیہ

صد برگ گل جاوید عشرت | جناب عشرت گیلادی کے سوا شعرا کا مجموعہ ہے جسے سید محمد اسماعیل صاحب رسا ہمدانی نے انتخاب کیا ہے۔

جناب عشرت سد بہار کے مشہور شاعر تھے اور فطرت تھی کہ ان کے کلام کو پیش کیا جاتا۔ سنا جاتا ہے کہ اُنکا دیوان بھی زیر ترتیب ہے۔ اس لئے اس انتخاب کو ”مقدمۃ الجیش“ سمجھنا چاہئے۔

یہ انتخاب دو آنے میں سید آل نبی۔ حسین منزل، گیا کے پتہ سے مل سکتا ہے۔

فراق

بھلس کے روٹھے پڑے تھے پوٹے۔ بھوار اُنکو مٹا رہی ہے
 ہوا سے بادل جو چھٹ رہے ہیں۔ جنیر سے موجوں سے کٹ رہی ہیں
 سواری گزری ہو شاہ طوفاں کی۔ رعد نے جسکو دی سلامی
 قمر کے جلوے سے ضوفاں ہو جو حلقہ بادل کی سلوٹوں کا
 گرس تھے بے ہوش ہو سکے پودے۔ ہوا اُنھیں کچھ نگہا رہی ہے
 کہ فوج فرعون ابتر تاریک۔ نیل میں غوطے کھا رہی ہے؟
 ہے خطرہ باقی جو برق کو ندی کی لال جھنڈی ہلا رہی ہے
 سنہرے ٹھپے کی گوٹ پشوازیں پڑی جگمگا رہی ہے

شجر حجر کے سیاہ دھبے ہیں شستہ پوشش یہ جو فضا کی
 سفید ریت کے اونچے ٹیلے ہیں گویا انبار چاندنی کے
 چمک رہے ہیں جوان پہ ذرے۔ ستارے ہیں خمیوں پر لپٹ گئے
 شکن میں ریت پہ ہلکی ہلکی زمیں کے ماتھے پہ پل پڑے ہیں
 چھوے نیتاں میں خشک ریشوں کے تار مخراب نے ہوا کی
 کدو کی سلیں سفید کلیوں سے سج کے ندی میں جھک رہی ہیں
 کسی پجاری نے ندی دیوی کو جھینٹ دی قاش خربڑ کی؟
 وہ پتھر چاندی کے لٹلے! ہجوم اک منتھی مچھلیوں کا
 زمیں پہ ہے عام جو نجاست وہ بہہ کے دریا میں آگئی کیا؟
 قمر سے فوارہ پھپکی تابش کا ان پہ فطرت گرا رہی ہے
 کہ بھری پریوں کی فوج۔ غائب نظر سے۔ خیمے بجا رہی ہے
 کرن قمر کی سفید ریشم سے ان میں طمانکے لگا رہی ہے
 بنجیل بادل کو پیاسی فصلوں کی ماں بگڑ کر ڈار رہی ہے
 نہاتی دُنیا پہ دھیمے نغمے سے وجد ہے۔ لہلہا رہی ہے
 کہ جوئے شیر کے کوڑیالوں کو دودھ اپنا پلا رہی ہے؟
 نہیں دایہ موجوں میں ناؤ عکس ہلال کی ڈلگتا رہی ہے
 سر پہ ٹاپو کے آسے تڑپا۔ اُنھیں بڑی مچھلی کھا رہی ہے
 غضب ہے انسان کی سیاست اثر یہاں بھی دکھا رہی ہے

یہ کون مجذوب ہے؟ درندے ہیں سائل التفات جسکے
 مجھے دکھی کر رہی ہے فطرت۔ سنگار پر اسکے کڑھ رہا ہوں
 اٹک کے پتھر سے موج چمکی سی لے تو سرگم کی تال ٹوٹے
 ٹہل رہا ہو کہیں نہ رزمی۔ اُسی کی آواز آرہی ہے
 ہے چاندنی نقری جہنم۔ ہوا جگر تک جلا رہی ہے
 ستارے سر جھڑے ہوئے ہیں کہ جلال ندی کی گاہی ہے؟

جمال منظر کی روح آجا! اداس زینت کو جگمگا جا!
 عروس فطرت سنور کے تیرے فراق میں گنگنا رہی ہے

مراغ

اس جا شریک حلقہ پا کاں نہیں ہے کون ؟
 سائے میں زر کے صاحب ایماں نہیں ہے کون ؟
 ساتھی کے فیض عام سے رخصتاں نہیں ہے کون ؟
 ممنون زلف و عارض تا باں نہیں ہے کون ؟
 قندیل علم و مشعل عرفاں نہیں ہے کون ؟
 ظلمات شر میں چشمہ حیاں نہیں ہے کون ؟
 پروانہ نگار شہبستاں نہیں ہے کون ؟
 آفاق میں امانت یزداں نہیں ہے کون ؟
 الہام کے اُفق پہ درخشاں نہیں ہے کون ؟
 آہنگ فقر بوذر و سلماں نہیں ہے کون ؟
 خلق وطن پہ خنجر بُتراں نہیں ہے کون ؟
 سلطان وقت و فاتحِ دُوراں نہیں ہے کون ؟
 ہم کافروں میں مردِ مسلمان نہیں ہے کون ؟

یارب جلے گا کون جہنم کی آگ میں ؟
 لعل و گہر میں سب کی جبیں پر جڑے ہوئے
 میخائے رسوم گہن میں بہ طرزِ نو
 زہرہ و شول کی دید سے ہے کون نامراد ؟
 اس تیرگی مرحلہ مرگ و زیست میں
 ضربِ کلیم و انفسِ روح الامیں ہے عام
 اُن دوسو سوں میں جن میں گرجتا ہے طبلِ جنگ
 کس کے نفس میں شعلہ شرع مہیں نہیں ؟
 ہر زرخ پہ آفتابِ امانت ہے خوفِ سنگ
 مشکل ہے فرق حیدر کتار و بولہب
 تفریقِ خاک و نسل ہے از روئے شرع کفر
 ارزاں ہے آدمی کا لہو اس قدر کہ آج
 کام و دہن ہیں نشہ دہنی سے شاد کام

شہاب - ملیح آبادی
 ہے شاعروں پہ آتشِ دوزخ اگر حرام
 ہندوستان میں صاحبِ دیواں نہیں ہے کون ؟

غزل : امین حزیں

کہ سکیں نالہ جسے ایک بھی سر ہو نہ سکا
 اپنی ہمت کی کمی تھی کہ سفر ہو نہ سکا
 دل ترا دل ہی رہا فکر و نظر ہو نہ سکا
 ہو گیا خاک وہ دانہ جو شجر ہو نہ سکا
 شاخ سے ہو کے جدا غنچہ ثمر ہو نہ سکا

دل سے اتنا بھی تو ہنگام سحر ہو نہ سکا
 دور رکھا مجھے منزل سے تن آسانی نے
 کورِ ذوقی کا گلہ ہے تجھے فطرت سے عبت
 ذرہ ذرہ کی جبیں پر ہے لکھا یہ مصرع
 زینت کو ترکِ تعلق ہے فنا کا پیغام

تہقیر دشمن جمعیتِ فاطمہ ہیں امیں
 قطرہ آغوش گل تر میں گہر ہو نہ سکا

پہلی ملاقات

جبیں میں محبت کی شمعیں فروزاں
وہ ہونٹوں کی لالی کہ صبح بدخشاں،
وہ زلفِ معنبر پریشاں پریشاں
وہ شفاتِ سینہ وہ سیبِ زرخشاں
وہ دستِ حنائی، محبت کا عنوان
گریزاں گریزاں، نمایاں نمایاں
وہ نازک خرامی کہ دنیا پہ احساں
اثر میں وہ ظالم قیامت کا ساماں
وہ معصوم نظریں پشیمان، پشیمان
وہ رکتا ہوا سا اُمنگوں کا طوفاں
نگاہوں میں جذبات کی موجِ غلطاں
ادھر بھی گلستاں، ادھر بھی گلستاں
اسی طرح وہ نازک اندام لرزاں
وہ بزمِ طرب اور مجھ سا غزلخواں

لبوں پر تبسم کے انوارِ رقصاں
وہ ماتھے کی افشاں ستاروں کی دنیا
وہ آنکھوں کے ڈورے گلابی گلابی،
وہ گردن کہ سچ پچ بلوریں صسراجی
وہ چاندی کی ترشتی ہوئیں صاف باہیں
تباتنگ اور عنفوانِ جوانی،
وہ قد جس پہ قربانِ حسنِ صنوبر
لچک میں وہ رفتار پھولوں کی ڈالی
وہ احساں جلووں کی غارت گری کا
وہ جھجکے ہوئے اُمنگیوں کے اشارے
خوشی میں دل کی اُمنگوں کے نغمے
مرے رُخ پہ سُرخِ جھلکنے لگی سچی
کسی کا پتے ہاتھ میں جیسے بوتل،
ہواؤں کو بھی وجد سا آ رہتا

تصور کو آئینہ دکھلا رہی ہے
وہ پہلی ملاقات یاد آ رہی ہے
ماہرِ قادری

غزل: فراق گورکھپوری

فسردہ ہو کے وہ کچھ اور بھی نکھرتا ہے
دلوں میں آج تک اک نقش سا اُبھرتا ہے
تری بلا سے کوئی اہلِ دل جو مرتا ہے
تری نگاہ پہ کیا کیا گساں گزرتا ہے
بگڑ بگڑ کے ہزاروں طرح سنوڑتا ہے
خوش یوں ہے کوئی جیسے بات کرتا ہے

شگفتگی تو ہے پھر بھی شگفتگی لیکن
وفا تو سنتے ہیں دنیا سے مٹ گئی لیکن،
وہ بات کون ہے دل میں جو حسن میں نہ لے
یہ امتزاجِ گناہ و ثواب اور کہاں
سنور سنور کے بگڑتا ہے دلِ محبت میں
زہے یہ عالم راز و نیازِ حسنِ ترا

ہے کل کی بات کہ محشر بپا تھا اس دل میں
فراق آج یہ گھر بھائیں بھائیں کرتا ہے

اس مہینے کے سوالات
پروفیسر انسن کو جانوروں کی تربیت کا بڑا شوق تھا چنانچہ اس نے تین بندروں کو جو بہت ذہین
تھے کچھ حساب بھی سکھاتا تھا۔ ایک بار امتحان اس نے ان میں سے ایک بندر سے جس کا نام جو کو تھا سوال



کیا کہ بتاؤ تمہاری عمر کیا ہے؟
جو کو نے جواب دیا کہ: ”ہم میں سے
کسی کی عمر کے تین چوتھائی سے
باقی دو میں سے کسی کی عمر کو
آپ ۱۱ سے ضرب دیئے تو میرے
کی عمر معلوم ہو جائے گی“
پروفیسر اس جواب سے حیران
رہ گیا، لیکن جب اس نے کاغذ
پنسل لیکر حساب لگایا تو جو کو کا
جواب بالکل صحیح نکلا۔
بتائیے یہ حساب کیا تھا؟

(۲) دو طالب علم مصطفیٰ راشد

اپنے گھر سے کھانا لائے تھے لیکن
تیسرا طالب علم محمد اپنا کھانا بھول
آیا تھا۔ جب کھانے کا وقت آیا تو
اسے کہا کہ مجھے بھی کھانے میں شریک
کرو اور پندرہ پیسے مجھ سے لیکر تم
دونوں آپس میں بانٹ لو۔ کھانے کے
پیسوں کی تقسیم میں جھگڑا ہوا
راشد نے کہا کہ میں تین روٹی اور
تین کباب لایا تھا۔ مصطفیٰ نے کہا
میں تین روٹی اور دو کباب لایا تھا
محمد نے دو کبابوں کو تین روٹیوں کے



برابران کو پیسے دونوں میں تقسیم کر دے۔ بتائیے تقسیم کیا تھی؟۔ پہلا سوال کا صحیح حل بھیجے والے کو ”ہندی شاعری نمبر“ اور دوسرے سوال کا
حل بھیجے والے کو ”مصطفیٰ نمبر“ کی ایک ایک کاپی مفت دی جائے گی۔ اودانعام کا فیصلہ قرعہ کے ذریعہ سے کیا جائے گا۔

مغل لائن لمیٹڈ

مسلمانوں کی قائم کی ہوئی واحد جہاز ران کمپنی

تھوڑے تھوڑے وقفہ سے بمبئی اور کراچی سے عدن پورٹ
سوڈان جدہ و سوئز کو جہازوں کی روانگی کا معقول انتظام
بمبئی اور کراچی سے عدن جدہ اور بحر احمر کی بندرگاہوں نیز لورٹ لونئی مارشس تک
مسافروں اور بار برداری کی سروسیں
تمام سروسیں اور تاریخیں بغیر کسی پیشگی اطلاع کے منسوخ کی جاسکتی ہیں

تفصیلات کے لئے خط و کتابت کیجئے:

مڈل مارکس اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۱۶۔ بینک اسٹریٹ بمبئی

نگار خانہ کتب خانہ

نیاز فختوری کی دیگر تصانیف

نگار خانہ کتب خانہ

ترغیبات حبشی (۱)	مجموعہ استفسار و جواب سہ جلد	جذبات بھاشا	فلاسفہ و تہذیب
شہوانیات اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات اور انکی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی تھی کہ مذہب عالم نے اسے روک دیا اور اس میں کتنی رد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے	ان تینوں جلدوں میں ۱۲۰۰ سے زائد سوالات کے استفسار و جواب دیئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار یہاں کیا گیا ہے کہ یہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان تینوں جلدوں میں ہندوؤں اور انکی تاریخی و نفسیاتی مسائل شامل ہیں اور اس کی حیثیت اگر محقق سے سی سائیکلو پیڈیا کی ہے۔	جناب نیپاز نے ایک دلچسپ و تہسید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ ۱۔ ۲۔ ۳۔	اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں :- ۱۔ چند فلسفے و فلاسفہ و تہذیب کی روحوں کے ساتھ ۲۔ ادب کا مذہب ۳۔ حرکت کے کرشمے نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔
قیمت تین روپیہ دس آنے علاوہ محصول	قیمت تین روپیہ دس آنے علاوہ محصول	قیمت بارہ آنے (۱۲) علاوہ محصول	قیمت ایک روپیہ دس آنے (۱۲) علاوہ محصول
شاعر کا انجام	فخر است الید	مذاکرات نیاز	گہوارہ گلشن
جناب نیاز کے عشقان و شہساز کا لکھا ہوا قصہ حسن و عشق کی تمام نشانیوں کی فطرت اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں یہ فساد اپنے بلاط اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔	مولفہ نیاز فختوری جن کے مطالعہ سے ایک شخص باسانی ہمت کی شناخت اور اس کی لکھنؤ کو دیکھ کر اپنے یا دہ سرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال موت و حیات، صحت و بیماری شہرت و نیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔	ایک حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالمیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو مشرور کر دینا انیسویں تک پڑھ لیتا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔	یہ وہ شعر و ادب کا کتاب ہے جس میں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیا کے تہذیب و شائستگی اس کی کس قدر ممنون ہے اردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی ہے نہ اس کو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔
قیمت دس آنے (۱۰) علاوہ محصول	قیمت ایک روپیہ دس آنے (۱۲) علاوہ محصول	قیمت بارہ آنے (۱۲) علاوہ محصول	قیمت دو روپیہ دس آنے (۱۲) علاوہ محصول

نگار کے خاص نمبر

نگار کے خاص نمبر

نگار کے خاص نمبر

جنوری ۱۳۶۷ء	جنوری ۱۳۶۶ء	جنوری ۱۳۶۵ء	جنوری ۱۳۶۴ء
ڈراما اصحاب کہف خطوط آسکر وائلڈ بنام سارہ برنہارٹ اور مسٹر خلافت و امامت پر پانچواں مقالہ ایک آزاد خیال شیعہ کے قلم سے۔ یہ خاص نمبر مختلف قسم کی دلچسپیاں رکھتا ہے۔ ڈراما اصحاب کہف اور خطوط آسکر وائلڈ بہترین انشا پر داری کا نمونہ ہے۔ صفحات ۱۴۴ قیمت ۱۲ روپیہ علاوہ محصول	(ہندی شاعری نمبر) ہندی شاعری کی تاریخ اور مستند شعرا کے کلام پر تبصرہ اور انتخاب کلام، اردو میں ہندی شاعری پر اس سے زیادہ بہتر انتخاب اور معلومات کا ذخیرہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔ صفحات ۱۶۸ قیمت ۱۲ روپیہ علاوہ محصول	اردو شاعری نمبر) اردو شاعری کی تاریخ اور ہر زمانہ کے شعرا پر نقد و تبصرہ اور انتخاب کلام یہ مجموعہ اردو شاعری پر اتنی معلومات رکھتا ہے کہ اس کے بعد کچھ کسی تذکرہ دیکھنے کی ضرورت نہیں رہتی متعدد مضامین اڈیٹر نگار کے قلم کے ہیں۔ صفحات ۲۳۶۔ اس میں اڈیٹر نگار کی قلمی تصویر بھی شامل ہے قیمت چار روپیہ (لحد) علاوہ محصول	(غالب نمبر) غالب شوخ نگار کی حیثیت سے، جس میں ان کی نظم و نثر دونوں کو سامنے رکھ کر ان کی شوخ نگاری کو دکھایا گیا ہے۔ صفحات ۱۵۶۔ معہ تصویر غالب (رنگین) قیمت دو روپیہ (عام) علاوہ محصول
جنوری ۱۳۶۸ء	جنوری ۱۳۶۹ء	جنوری ۱۳۷۰ء	جنوری ۱۳۷۱ء
یہ نمبر دنیائے تذکرہ میں بالکل پہلی چیز ہے یعنی اس وقت کے تمام مشہور غزل گو شعرا نے خود اپنے حالات لکھے ہیں اور خود اپنے کلام کا انتخاب کیا ہے، اسی کے ساتھ ایک مقالہ غزل گوئی پر بھی موجود دیکھنے کے قابل ہے قیمت دو روپیہ (عام) علاوہ محصول	(نظریہ نمبر) اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:۔ حیات مصحفی۔ اردو غزل گوئی میں مصحفی کا مرتبہ مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں۔ انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ۔ صفحات ۱۶۸ قیمت ایک روپیہ (عام) علاوہ محصول	(مصحفی نمبر) اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:۔ حیات مصحفی۔ اردو غزل گوئی میں مصحفی کا مرتبہ مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں۔ انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ۔ صفحات ۱۶۳ قیمت ایک روپیہ (عام) علاوہ محصول	تاریخ اسلامی ہند۔ یہ تاریخ جس وقت نظر لے کاوش و تحقیق کے بعد مرتب کی گئی ہے اس کا اندازہ آپ کو مطالعہ کے بعد معلوم ہوگا جغرافی و واقعاتی تحقیق اصل ماخذوں سے کی گئی ہے۔ صفحات ۱۵۲ قیمت دو روپیہ (عام) علاوہ محصول

(مطبوعہ دارالکتاب اسلام آباد) (نمبر ۱۳۶۷ء و ۱۳۶۸ء: ایس جی سینا)